کہیں نصیب مرے

ماہا ملک

ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ ساتھ بجتی ہوئی تالیاں، اور تالیوں کے ساتھ ہاتھوں میں پہنی چوڑیوں کی جھنکار اور جھنکار کے ساتھ ملی جلی ہنسی کی آوازیں، لڑکیاں کہیں کہیں لہک کر گانا شروع کرتیں، اور پھر بیچ میں رُک کر سر جوڑ کر جانے کیا بات کرنے لگتیں۔ ڈھولک اور تالیاں بجتی رہتیں۔ لمبا سا گھونگھٹ نکالے آگے پڑی نہایت موٹی اور لمبی چٹیا کے بلوں پر غور کرتی نصیبے بار بار چونکتی۔ آس پاس بیٹھی گاتی بجاتی لڑکیاں اس کی سکھیاں کہلائی تو جا سکتی تھیں مگر درحقیقت تھیں نہیں۔ ابھی اسے اس گاؤں میں آئے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ جو وہ سکھیاں بناتی۔ کل پندرہ دن پہلے ہی تو وہ یہاں آئی تھی۔ اور آج ٹھیک پندرھویں دن ہی مایوں کا پیلا جوڑا پہنے، سر میں نو من تیل لگائے، ہاتھوں میں مہندی کے خطرناک سے گل بوٹے سجائے، گھونگھٹ نکالے زندگی میں پیش آنے والے اچانک اور مسلسل واقعات پر غور کر رہی تھی۔

کل اس کی شادی تھی۔ حالانکہ اس وقت بھی اسے پوری طرح اس بات کا علم نہ تھا کہ کل اس کی شادی ہو گی یا نہیں۔ کیونکہ شادی کے لیے کم از کم ایک عدد دولہا کی موجودگی ناگزیر ہوتی ہے۔ اور وہ ممکنہ دولہا کل آتا ہے یا نہیں، اس کا زیادہ انحصار اس کی قسمت پر تھا۔ خوشی، مسرت، اور وہ کیفیت جو اس وقت اس کی ہونی چاہیے تھی۔ اس پر عجیب سے ڈر، خوف اور کشمکش نے غلبہ حاصل کر رکھا تھا۔ یہ گانا، بجانا، لڑکیوں کا گاتے گاتے کھلکھلا کر ہنسنا اور ذومعنی باتیں کرنا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل دھڑک دھڑک کر ایک ہی سوال کرتا تھا کہ وہ آئے گا یا نہیں،

آئے گا یا نہیں؟ وہ۔ اس کا مستقبل کا ممکنہ شوہر، جس کے بارے میں فی الوقت وہ صرف دو باتیں جانتی تھی۔ نمبر ایک اس کا نام حیدر ہے۔ نمبر دو، وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ اور بس! اس سے زیادہ نہ تو وہ جانتی تھی اور نہ اس نے جاننے کی کوئی کوشش کی تھی۔ خالہ جیراں نے شہر سے واپس آ کر اس سے یہی کہا تھا۔

"نصیبے! میری جان تو فکر نہ کر۔ وہ بیٹا ہے میرا، میرا خون ہے۔ دودھ پلایا ہے میں نے اسے اپنا، فرض تو اسے چکانا پڑے گا نا۔ میں کہہ آئی ہوں اس سے کہ دیکھ اگر چاند کی گیارہ کو تو نہ آیا تو مرا منہ دیکھنا میرا۔ وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ میرا حیدر دل کا بہت اچھا ہے۔"

ان کی ان باتوں سے وہ اتنا ہی جان پائی تھی کہ وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ اور آج چاند کی گیارہ تھی اور نصیبے اس "دل کے اچھے" کے نام کی مہندی تھوپے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دل کہتا تھا کہ وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ بھلا کوئی اپنی ماں کا مرا ہوا منہ دیکھنے کی بات سن کر بھی نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے؟ دماغ کہتا تھا کہ پگلی وہ شہروں کا رہنے والا ہے۔ کیا ہوا جو اس نے ایک گاؤں کی عورت کا دودھ پیا ہے تو پانی تو شہر کا ہی پیتا ہو گا نا۔ ایسا پانی جو ہر رشتہ بھلا دیتا ہے۔ مٹی کی خوشبو بھلا دیتا ہے۔ وہ بھلا کیوں ایک ان پڑھ، ان دیکھی لڑکی سے بیاہ رچانے چلا آئے گا۔ دل و دماغ میں کب سے یہی کشمکش تھی، یہی جنگ جاری تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور نوری نے اندر جھانکا۔

"او جی حیدر بابو آ گئے نیں!"

بڑے شوخ لہجے میں وہ زندگی سے بھرپور حملہ کرے

میں پھینک کر پھر بھاگ لی۔ اور کمرے میں جیسے طوفان آگیا۔ لڑکیاں اُٹھ اُٹھ کر دوپٹے سنبھالتی دولہا کا دیدار کرنے بھاگیں۔ اور نصیبے کے سینے میں جانے کب سے رُکا ہوا ایک لمبا سا سانس باہر نکلا۔ آگے پڑی ہوئی چوٹی کو ایک جھٹکے سے پیچھے پھینک کر اس نے مٹی کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ مطمئن ہو کر آنکھیں بند ہوئیں۔ اور لب مسکرانے لگے۔

ڈیڑھ مہینہ پہلے کی بات تھی جب پانی سے بھرا مٹکا سر پر رکھے وہ اپنے کچے مگر صاف ستھرے گھر میں داخل ہوئی تو سامنے چارپائی پر تڑپتے ہوئے باپ کو دیکھ کر اوسان کھو بیٹھی تھی۔

"بابا۔ بابا۔ کیا ہوا ہے؟" مٹکا، کچی گھڑونچی پر ٹکا کر وہ باپ کی طرف لپکی۔

"نصیبے۔ دھی۔ آخری وقت آگیا تیرے باپ کا!"

درد کی شدت سے بے حال باپ مرگئے۔ یہی آخری الفاظ تھے، جنہیں وہ سن پائی تھی۔ پھر یاد رہا تو اتنا کہ اس کے باپ کو چار آدمی کاندھا دے کر گھر سے لے گئے تھے۔ وہ گھر جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ جہاں قدم قدم پر طرح طرح کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ پیارا سا

چھوٹا سا گھر اسے چھوڑنا پڑا تو اپنی خالہ کے سینے میں منہ چھپا کر وہ بلک بلک کر رو دی۔

"نہ میری بیٹی روتے نہیں ہیں۔ مرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے!" خالہ جیراں نے اس کے سیاہ بال پیار سے سلجھاتے ہوئے کہا۔

"خالہ۔ خالہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ اپنا گھر، اپنا گاؤں نہیں چھوڑنا مجھے!" اس نے روتے روتے کہا۔

بے جان دیواروں میں کیا رکھا ہے پتری؟ نہ تیری ماں رہی نہ تیرا باپ۔ اب یہاں کون ہے تیرا؟ پھر جوان لڑکی تو بڑی ذمہ داری ہوتی ہے بیٹی۔ کون قبول کرے گا یہاں تیری ذمہ داری؟ میں تیری خالہ ہوں۔ تیری ماں کی ماں جائی ہوں بیٹی۔ میرے ساتھ چل۔ تجھے اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی۔ اپنی بہن کی نشانی کو اپنی آنکھوں کا تارا بنالوں گی میں۔ چل میری بچی چل!"

یوں وہ خالہ کے سینے سے لگی لگی اس نئے گاؤں اور نئے گھر میں آگئی۔ یہاں آکر اسے خبر ہوئی کہ جتنی اسے خالہ کی ضرورت تھی اتنی ہی خالہ جیراں کو اس کی ضرورت تھی۔ اس مٹی کے بنے ویران گھر میں وہ سارا دن اور ساری رات کھانستی تھی اور کوئی اس کی دوا اور پانی پوچھنے والا نہ تھا۔ خالہ جیراں کا ایک بیٹا تھا جسے پڑھانے لکھانے کی خواہش میں خالہ نے خود اسے دس سال کی عمر میں ہی خود سے جدا کر دیا تھا۔ بقول خالہ جیراں کے حیدر دس سال کا تھا جب اسے اس کے چچا کے پاس شہر بھیجا تھا کہ وہ اسے پڑھا لکھا کر اچھی سی نوکری دلا دے۔ اور جب اس نے واقعی پڑھ لکھ کر وہاں نوکری کی تو کئی بار بوڑھی ماں کو لینے گاؤں آیا مگر خالہ کو اپنی زمین، اپنی مٹی سے اٹوٹ محبت تھی۔ وہ یہیں پیدا ہوئی تھی۔ یہیں اس نے اپنی جوانی گزاری تھی۔ اور اب مر کر اسی مٹی میں ملنا چاہتی تھی۔ یوں وہ اپنی مٹی کی محبت میں بیٹے کی جدائی سہتی رہی۔ اور اب جب اس کی تنہائی میں حصے دار بن کر نصیبے آئی تو چند دن بعد ہی خالہ جیراں کے سینے پر جیسے ایک بھاری بوجھ آن پڑا۔ جب رات کو اس کے سینے میں دھواں بھر کر کھانسی کی صورت میں باہر نکلتا تو پاس کی چارپائی پر لیٹی نصیبے کا خیال اس کی کھانسی میں مزید اضافے کا سبب بن جاتا۔ یوں نصیبے کے آنے کے صرف دس دن بعد ہی خالہ جیراں شہر جا کر بیٹے کو قسم دے آئی کہ اگر اسے اپنی ماں سے ذرا بھی محبت ہے تو وہ نصیبے کا ہاتھ تھام لے۔

"وہ میری مری بہن کی نشانی ہے حیدر۔ میں مرگئی تو کڑی دھوپ کے نیچے بے آسرا کھڑی ہوگی وہ۔ میں لے بڑے مان سے لائی ہوں۔ بڑے غرور سے سہارا بنی ہوں اس کا۔ اب اسے بے سہارا اور بے آسرا دیکھنے کا خیال ہی میرے دل کو نوچ لیتا ہے۔ تجھے اس کا سہارا بننا ہوگا۔ اس کا ہاتھ تھامنا ہوگا۔ اسے تو اپنی غریب ماں کی آخری التجا سمجھ لے یا حکم۔ تجھے ایسا کرنا ہوگا!"

بیٹے کو قسمیں دے کر اپنے مرنے کی دھمکی دے کر وہ بڑی مطمئن ہو کر گاؤں لوٹی تھی۔

"تو فکر نہ کر!" نصیبے کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو دیکھ کر اس نے کہا تھا۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔ ساری عمر مجھ سے دور رہا بھی تو کیا ہوا۔ خون تو اس میں میرا ہی ہے نا۔ تو دیکھ لینا وہ ضرور

ئے گا۔ بس تُو بے فکر ہو کر دلہن بننے کی تیاری کر۔ اللہ بخشے
تیرے ماں باپ نے تو تنکا تنکا جوڑ کر رکھا ہے تیرے
لیے۔ مجھے تو کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔"

بے فکر ہو کر وہ کُھلے آسمان تلے لیٹ گئی تھی مگر نصیبے
کی نیند اڑا دی تھی اس کی باتوں نے۔ پھر یہ چند دن عذاب
بن کر گزرے اس پر۔ خالہ جیراں نے تو یہ خبر سارے گاؤں
میں نشر کر دی تھی کہ چاند کی گیارہ کو نصیبے کی شادی اس کے
بیٹے حیدر سے ہے۔ تب سے ہر روز گاؤں بھر کی لڑکیاں
رات کو جمع ہو کر گانے گاتیں۔ اور نصیبے کو مزید بے قرار
کرتیں۔ مگر آج جیسے اسے زمانے بھر کا قرار مل گیا تھا۔
جیسے دھانوں میں پانی پڑ گیا تھا۔ خالہ جیراں کا یقین اور
ممتا کا غرور۔ اور نصیبے کی دعائیں اور آنسو رنگ لائے
تھے اور وہ واقعی آ گیا تھا جسے اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔
جس کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ سوائے اس کے
کہ وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ اور اب اسے دیکھنا تھا
کہ آنے والا دل کا کتنا اچھا ہے۔

کھڑکی سے چپکی ہوئی نوری اور حسینہ کی ہلکی ہلکی، دبی
ہوئی ہنسی کی آواز اسے واقعی بے حد بے قرار کر رہی تھی۔
دل کہتا تھا کہ وہ بھی اُٹھے اور بیچ میں حائل صرف دو قدم
کے فاصلے کو عبور کر کے خود بھی کھڑکی سے جا کر چپک جائے
نوری اور حسینہ بھی اسے ہنسی ہنسی میں ایک دو بار یہ
پیشکش کر چکی تھیں۔ لیکن وہ باوجود چاہنے کے بھی اُٹھ کر
کھڑکی تک نہ جا سکی۔ کھڑکی کی خاص بات یہ تھی کہ وہ دوسرا
طرف جس کمرے میں کھلتی تھی۔ وہاں خالہ جیراں اور حیدر
بیٹھے تھے۔ خالہ بیٹے کو جانے کیا باتیں سمجھا رہی تھی۔ جو ختم
ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔

"نصیبے۔ آجا نا دیکھ لے اپنے راجہ کو۔" حسینہ نے
پھر اسے ہلایا۔

"ارے تُو تو واقعی اپنے نام کی ایک ہے۔ کیا شہزادہ
اتارا ہے خدا نے تیرے لیے آسمان سے۔ اری آجا نا!"

اب کی بار وہ واقعی نہ رہ سکی۔ اور آہستہ سے اُٹھی۔
اور شرمیلی مسکراہٹ چہرے پر سجائے دھیرے دھیرے

قدم اٹھاتی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔
"سلے دیکھو!" ان دونوں نے اس کے ساتھ شرارت کی اور اسے دھکا دے کر کھڑکی سے بالکل چپکا دیا۔ اور خود دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ہنسی کی آواز کھڑکی کی سلاخوں سے گزر کر عین سامنے — بیٹھے حیدر کے کان میں پڑی اور اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ پیلے جوڑے میں ملبوس پیلے ململ کے دوپٹے سے آدھا ماتھا ڈھکے بے حد گھبرائی ہوئی نصیبے سے اس کی آنکھیں دو گھڑی کو چار ہوئیں اور دوسرے لمحے اس نے بڑی بد مزگی سے منہ پھیر لیا۔
"ہائے ربا مر گئی میں تو!" سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ بڑی تیزی سے سلاخوں سے علیحدہ ہوئی اور ایک ایک دھموکا کھی کھی کرتی نوری اور حسینہ کو جڑا۔
"مرجاؤ اللہ کرے، دونوں کی دونوں۔" ان دونوں کو اوپری دل سے بددعا دے کر وہ مسکراہٹ پر قابو پاتی کمرے کے بالکل کونے میں جا گھسی۔
"ہائے اللہ کتنے خوبصورت ہیں وہ۔ پر کچھ روٹھے روٹھے سے ہیں۔ ہاں جی روٹھنا تو حق ہے ان کا۔ کیسی زبردستی بھی تو کی ہے خالہ نے (اچھا ہی کیا) روٹھ کر تو اور بھی اچھے لگ رہے ہیں۔" کونے میں منہ دیے وہ سوچتی رہی۔ اور شرماتی اور مسکراتی رہی۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ اور آنے والا کل اس کے لیے ایک نئی زندگی۔ ایک نئی امید اور خوشیوں کے بہت سے سندیسے لا رہا تھا۔ بقیہ رات وہ کوشش کے باوجود نہ سو سکی۔ اور تا سحر جاگتی ہی رہی۔

مئی کی چلچلاتی گرمی میں جب ہر شے جیسے پانی بن کر بہہ جانے کو تیار ہوتی ہے، نصیبے شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ صبح سے ہی گاؤں بھر کی لڑکیاں اسے حسن مجسم بنانے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ اور اتنے سارے "ماہرانہ" ہاتھوں نے مل کر اسے جو "شاہکار" بنا دیا تھا۔ وہ نہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بھری دوپہر میں وہ چیخیں مارتا ہوا۔ نارنجی و سرخ قسم کے رنگ کا کھڑکھڑاتا ہوا ریشمی جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔ سانولے ہاتھوں پر موٹی موٹی مہندی رچ کر کالی ہو چکی تھی۔ اور ہاتھوں کو جلانے کے بجائے جلا بخش رہی تھی۔ بالوں کا تیل بہانے کے باوجود بالوں کا ساتھ چھوڑنے سے انکاری تھا۔ شدید گرمی کی وجہ سے تیل کا بیشتر حصہ سر سے بہہ کر ماتھے پر آ چکا تھا۔ جس کی وجہ سے میک اپ پر کافی برا اثر پڑا تھا۔
دوسرے یہ کہ دلہن بنتے ہوئے غلطی سے کسی لڑکی نے اسے وداعی کا سین یاد دلا دیا تھا۔ بس پھر جو نصیبے پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی تو اس وقت چپ ہوئی جب آنکھوں میں لگا موٹا موٹا کاجل پھیل کر پورے چہرے پر پھیل گیا۔ غرض یہ کہ وجوہات تو کئی تھیں لیکن نتیجہ ایک ہی تھا یعنی وہ مکمل طور پر ایک کارٹون دلہن میں ڈھل گئی تھی۔ اور پھر جیسے جیسے دن ڈھلا اور گاؤں کی فضا پر رات اتری ویسے ویسے اس کی "خوفناکی" میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا گیا۔ نو بجے تک سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو کوچ کر گئے۔ فضا میں مینڈکوں اور جھینگروں کے بولنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔
خالہ چند لمحے قبل اسے پیار کر کے اور نصیحتیں کر کے جا چکی تھیں۔ اور اب وہ دونوں گھٹنے بازوؤں کے حصار میں لیے بیٹھی تھی۔ پچھلی کئی راتیں اس نے خوف و پریشانی میں جاگ کر گزاری تھیں۔ اور آج مطمئن و بے فکر ہو کر اسے نیند آنے لگی تھی۔ اور گاؤں میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ اور گاؤں میں ہی پلی بڑھی تھی۔ اس لیے اسے بالکل پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس وقت کمرے میں کس قدر حبس اور گھٹن ہو رہی تھی۔ کوئی مچھر کبھی کبھار چپکے سے آ کر اسے ڈنک چبھوتا تو وہ اونگھتے اونگھتے ذرا سا چونکتی اور سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے جانے کتنی دیر گزر گئی۔ وہ گاؤں کی باسی تھی جلد سونے کی عادی تھی۔ اس لیے اس وقت نیند سے تقریباً بے ہوش ہو رہی تھی۔ جب ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور حیدر اندر آیا۔ بے ہوش ہوتی ہوئی نصیبے کے تمام ہوش و حواس بیک وقت بیدار ہو گئے۔ کمرے میں موجود واحد ساٹھ واٹ کا بلب مدھم سی روشنی بکھیر رہا تھا۔ اس آنے والے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دور سے سمجھنے کی کوشش کی کہ بستر پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ اس وقت اس کے چہرے کی جو حالت تھی۔ وہ اتنی دور سے کیا نقشہ پیش کر رہی تھی اس بات سے ناواقف نصیبے شرم سے دوہری ہو کر گٹھڑی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔
حیدر چند لمحے دروازے پر ہی کھڑا کشمکش کا شکار

رہا کہ آیا پلنگ پر موجود شے واقعی اس کی دلہن ہے۔ یا کسی نے شرارت میں آ کر کوئی پتلا وغیرہ سجا دیا ہے۔ بالآخر ایک فیصلہ کر کے وہ آگے بڑھا اور آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ نصیبے نے منہ اتنا جھکا دیا کہ بس چادر سے لگنے ہی لگا۔
"اوفوہ۔ بھئی شکل تو دیکھنے دو۔"
قدرے جھنجلائی و جھنائی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور پھر اس نے نصیبے کو شانوں سے پکڑ کر سختی سے سیدھا کر دیا۔ نصیبے اس حرکت پر بے اختیار ہنس دی اور پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔
"اوہ گاڈ! مائی گاڈ!"
اس پر جیسے تاسف کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ چند لمحے اس کے چہرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتے رہنے کے بعد۔ وہ یک لخت اٹھا اور مڑ کر کمرے کی آخری حد تک چلا گیا۔ دیوار کے قریب جا کر رکا۔ اور کافی دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے ایسے ہی دوسری طرف منہ کیے کھڑا رہا۔ نصیبے قدرے حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی قطعاً سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حیدر کی اس حرکت کی وجہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے صبح سے ایک بار بھی آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میک اپ ہونے پر وہ تو خود کو بے حد حسین تصور کیے بیٹھی تھی۔ اور پھر سب نے یقین بھی تو دلایا تھا کہ وہ واقعی حسین لگ رہی ہے کہ اس کا دولہا اسے ایک نظر دیکھتے ہی دل نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دے گا۔ اور اب وہ ناقدرا کہیں کا اسے دیکھنے کے بجائے مٹی کی بنی بے جان دیوار کو دیکھ رہا تھا۔
حیرانی کی بات تو تھی ناں!
تھوڑی دیر بعد بت بنے حیدر میں جان پڑی اور اس نے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مارچ شروع کر دی۔ پنڈولم بنا وہ اس دیوار سے اس دیوار تک جاتا پھر واپس پلٹ کر نقطۂ آغاز پر پہنچتا۔ پھر وہاں سے دوبارہ مڑ جاتا۔ نصیبے کی گردن اس کی اس خطی گردش کے ساتھ ساتھ حرکت میں تھی۔ کافی دیر تک جب وہ یونہی پنڈولم بنا رہا تو نصیبے کے صبر نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔
"وہ جی۔ آپ کے پیٹ میں درد ہے کیا؟"
بالآخر بڑی ہمدردی سے اس نے پوچھ ہی لیا۔ جواباً ایک بڑی گہری اور طویل سانس کی آواز سنائی دی۔ اور اس کی اس حرکت میں قدرے تیزی آ گئی۔ رات تقریباً آدھی گزر گئی تھی۔ جواب سے مایوس ہو کر اس نے سر کو گھٹنوں میں ٹکا لیا۔ اس کی نیند پوری کی پوری اڑ چکی تھی۔ اور وہ حیدر کے اس عمل کی وجہ جاننے سے بھی قاصر تھی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اسے دوبارہ نیند آنے لگی۔ اور ابھی اس نے نیند کی وادی میں پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ ایک تیز آواز نے دوبارہ پیچھے کھینچ لیا۔
"سنیے!" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ عین اس کے سر پر کھڑا تھا۔ مگر سامنے دیوار کو گھور رہا تھا۔
"وہ جی۔ مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟" اس نے حیرانگی سے پوچھا۔
"مجبوری یہ ہے کہ کمرے میں آپ کے علاوہ مزید کوئی جاندار شے موجود نہیں جسے میں مخاطب کر سکوں سوائے مچھروں کے۔" آواز اور الفاظ میں بلا کی کاٹ تھی۔
"اس لیے میں آپ سے ہی مخاطب ہوں۔" وہ بدستور دیوار کو ہی دیکھ رہا تھا۔
"او جی۔ تو بولیے نا۔ حکم کریں۔" وہ دھیمے سے بولی۔
"حکم کرنے کی بندے کی مجال نہیں۔" اس نے دانت پیسے۔
"درخواست یہ ہے کہ میں سونا چاہتا ہوں۔"
"تو سو جائیں نا۔ میں نے منع کب کیا؟" وہ سہم سی گئی۔ اس کے انداز پر۔
"مجھے یہ بستر خالی چاہیے۔" اب کی بار کافی غرا کر کہا گیا۔ اور خوفزدہ نصیبے ایک چھلانگ میں بستر سے اتر آئی۔
"شکریہ!" لفظ شکریہ جیسے اس کے منہ پر مار کر اس نے بستر کی چادر اٹھا کر گلاب کی پتیاں زمین پر جھاڑیں۔ اور بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔
"ہم۔ میں اتار دوں جی؟" وہ منمنائی۔ وہ خاموشی سے جوتے اتارنے میں مصروف رہا۔ جوتے اتار کر پلنگ کے نیچے کھسکائے اور لیٹ کر منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ وہ ایسے ہی پلنگ کی پائنتی ہراساں اور پریشان کھڑی رہی۔ نئی نویلی دلہن کے ساتھ ایسے سلوک کے بارے میں اس نے اپنی تئیس سالہ زندگی میں نہ کبھی دیکھا۔ نہ سنا تھا۔ کمرے میں موجود واحد پلنگ پر سے اسے اٹھا کر وہ اس بات سے لاتعلق لیٹا ہوا تھا کہ اب وہ کہاں جائے گی۔ وہ تھوڑی دیر کھڑی رہی

پھر مڑی اور جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔؟

"اُفوہ" جھنجلاہٹ بھری آواز پر اس نے بستر کی جانب دیکھا۔ وہ مچھروں کی یلغار سے عاجز آیا ہوا تھا۔ اور بار بار کسی نہ کسی حصے پر ایک جھانپڑ جڑ دیتا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اُٹھی۔ الماری پر رکھا کھجور کا پنکھا اُٹھا کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بدن سے ٹکرائی تو وہ حیرانی سے مڑ کر دیکھنے لگا۔

"او جی۔ پھر تنگ کر رہے ہیں نا آپ کو" وہ شرما کر مسکرائی۔

"او جی۔ میں مچھروں کو برداشت کر لوں گا مگر" اس کی نقل اُتار کر اس نے کچھ کہنا شروع کیا پھر خاموش ہو گیا۔

"برائے مہربانی مجھ غریب پر کرم کیجیے۔ اور اس پلنگ سے کم از کم چار فٹ کا فاصلہ قائم رکھیں" جلے کٹے لہجے میں کہی گئی بات سے اس نے صرف یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اسے دور جانے کو کہہ رہا تھا۔ مایوس ہو کر وہ اپنی جگہ پر پلٹ آئی۔

"سی" وہ پھر اپنا بازو کھجانے لگا تو نصیبے کو دوبارہ پریشانی لاحق ہوئی۔ نصیبے کی موجودگی میں اسے کوئی تکلیف ہو یہ بات وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اُٹھی۔ ٹاٹ کا ایک ٹکڑا لیا اور کونے میں رکھ کر اسے سلگا دیا۔ مچھروں کو بھگانے کا یہ طریقہ وہ کافی بار آزما چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب کمرے میں کافی دھواں بھرا تب وہ بوکھلا کر پلنگ سے اُتر آیا۔

"یہ۔ آگ" آگے اس سے بولا نہ گیا۔ اور وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔

"او جی۔ آگ نہیں لگی" اس کی معصومیت پر نصیبے کو بڑی ہنسی آئی۔

"میں نے مچھروں کو بھگانے کے لیے ٹاٹ سلگائی



ہے" اس نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔

"ایسی کی۔ کھوں کھوں کھوں۔ تیسی تمہاری۔ کھوں کھوں ٹاٹ کی" آگے بڑھ کر اس نے لاتیں مار مار کر سلگتی ٹاٹ کو ادھ موا کر دیا۔ ٹاٹ کے بجھنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک لاتیں برسا کر اپنا غصہ اُتارتا رہا۔ وہ ڈری سہمی دیوار سے چپکی اس کا پہلا غصہ دیکھتی رہی۔

"ناؤ پلیز گیٹ آؤٹ" وہ اس کی جانب مڑا اور ایک نہ سمجھ میں آنے والی بات کہہ کر جا کر دھڑ سے بستر پر گر گیا۔

بات تو سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن لہجہ اس قدر خراب تھا کہ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان جاری ہو گیا۔ اپنی سسکیوں کو دونوں ہاتھوں سے منہ دبا کر روکا۔ اور کمرے کے کونے میں منہ دیے نصیبے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔ سحر کا ہلکا ہلکا دھندلکا سا تھا۔ جب اسے بیٹھے بیٹھے ہی نیند آ گئی تھی۔

"میری بچی! میری رانی۔ کچھ دن بھی تو میرے پاس نہ رہی تو جی بھر کر تجھے دیکھ ہی نہ سکی تھی، لاڈ اُٹھانے کا موقع کیسے ملتا۔ آئی تھی تو بیاہی گئی تھی جا رہی ہے تو بہو بن کر اب تو اور بھی یاد آئے گی تو مجھے۔ دل ترسے گا تجھے دیکھنے کو۔ تجھ سے ملنے کو"

خالہ اس سے لپٹی آنسو بہا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ بولتی بھی جا رہی تھیں کبھی کبھار شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس کو چوم بھی لیتی تھیں نصیبے کسی پتھر کے بت کی مانند بیٹھی تھی۔ اس کے اندر آنسوؤں کا لاوا اُبل رہا تھا۔ مگر آنکھیں خاموش تھیں۔ خالہ کو چھوڑ کر حیدر کے ساتھ شہر جانے کا خیال اس کے لیے اس قدر روح فرسا تھا کہ مارے خوف سے نہ تو اس سے بولا جا رہا تھا۔ اور نہ ہی آنسو نکل رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کھلی فضاؤں سے اچانک ہی کسی زنداں میں دھکیلا جا رہا ہو۔ کسی نئی دلہن کے لیے اس طرح کی سوچ رکھنا بڑی عجیب سی بات تھی لیکن قصور وار نصیبے نہیں تھی۔ گزشتہ تین روز میں حیدر کی جانب سے روا رکھا گیا سلوک تھا۔ اس پہلی رات کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں نہیں آیا تھا۔ گرمی اور گھٹن کا بہانہ کر کے صحن میں سوتا تھا۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک بار بھی نصیبے کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ اس کی طرف دیکھتا تک نہیں تھا۔ نصیبے حیران رہتی تھی کہ وہ سامنے کھڑی ہوتی تو وہ دیوار

کو گھورنے لگتا۔ وہ کھانے کا پوچھتی تو پنکھے کی طرف منہ کر کے "ہاں" "ہاں" "ناں" کہتا۔ وہ اس سے نظر کیوں چراتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے بے حد حیران کن تھی۔ غریب نصیبے تنگ آ کر خالہ سے پوچھ بیٹھی تھی کہ۔

"خالہ جی! ان کی آنکھوں میں کوئی خرابی ہے کیا؟"

"کیسی خرابی۔ رب نہ کرے۔ تو کیسی باتیں کر رہی ہے؟" خالہ کو بڑی حیرانی ہوئی اس کا سوال سُن کر۔

"میرا مطلب ہے خالہ۔ کچھ ترچھا دیکھتے ہیں کیا؟" اس نے بڑی مشکلوں سے پوچھا۔

"ہائے ہائے کملی ہے کیا؟ ایسی خوبصورت آنکھیں تو پورے گاؤں میں کسی کی نہیں ہیں۔ رب نہ کرے جو میرا پتر ترچھا دیکھے"

خالہ باقاعدہ ناراض ہو گئیں۔ بڑی مشکلوں سے اس نے بات کو ٹالا۔ اور آج وہ اس کے ساتھ شہر جا رہی تھی۔ تن تنہا اس کے غیض و غضب کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی اس کا دل ہول رہا تھا۔

"دیکھ نصیبے! تو جانتی ہے۔ کہ میرا حیدر دل کا بڑا سوہنا ہے۔ تجھے دیکھے بغیر جانے بغیر اس نے صرف میرے کہنے پر شادی کی ہامی بھری ہے۔ شہر میں پلنے والے ایسے ہوتے نہیں ہیں۔ تو جی جان سے اس کا خیال رکھنا۔ اس کی ناراضگی تو پل بھر کی ہوتی ہے۔ دیکھنا پھر کیسے پیار سے رکھے گا تجھے"

خالہ کی ڈھیر سے پیار سے سمجھائی گئی باتوں نے کچھ دل کا بوجھ ہلکا کیا تو وہ اچانک ہی ان کے گلے سے لگ کر سسکنے لگی۔

"ہے پاگل" خالہ آنسوؤں بھری ہنسی ہنسیں۔

"رو رہی ہے۔ ہاں شروع میں تو سبھی روتی ہیں۔ چل رو لے۔ ہلکا کر لے دل کا بوجھ، پھر ہنسنا ہی تو ہے ساری حیاتی۔ رب نے جو چاہا"

اور ان کے ایسا کہنے پر وہ واقعی دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے حیدر کی نگاہ بے ساختہ اس کی جانب اُٹھی۔ لشکاریں مارتا پیلا جوڑا گرمی میں مزید لشکاریں مار رہا تھا۔ آنکھوں کا کاجل حسب سابق گالوں پر بے تکلفی سے دوڑ رہا تھا۔ اور گہری سُرخ لپ اسٹک سوائے ہونٹوں کے سارے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور نصیبے منہ پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔

"اماں۔ جلدی کرو۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو رہی ہے" تین دن پہلے والا شدید غصہ آج پھر اعصاب سے جنگ لڑنے چلا آیا۔

"ٹھہر جا پتر۔ جی بھر کر پیار تو کر لینے دے" اماں نے نصیبے کا ماتھا چوما تو حیدر کو شدید کوفت ہوئی۔

"اس پر بھی کسی کو پیار آ سکتا ہے؟" وہ دل میں سوچ کر رہ گیا۔

نصیبے سے فارغ ہو کر خالہ نے حیدر کو لپٹا لیا اور کافی دیر تک بے آواز روتی رہیں۔ وہ بھی خاموشی سے کھڑا ان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"بس اماں۔ اب چلنا ہے" کافی دیر بعد وہ بولا۔

"ہاں پتر۔ بسم اللہ کرو" خالہ نے نصیبے کے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ حیدر نے خاموشی سے آگے بڑھ کر سامان اُٹھا لیا۔ خالہ نصیبے کو سینے سے لگائے گھر سے نکلیں گھر سے کچھ فاصلے پر کچے راستے پر اس کی کار کھڑی تھی نصیبے کا سامان ڈگی میں رکھ کر اس نے پچھلا دروازہ کھولا۔

"چلو بیٹھو" جانے کتنی مشکلوں سے اس کو مخاطب کیا تھا۔

"نہ پتر۔ پیچھے کیوں آگے بٹھا اپنے ساتھ۔ نئی دلہن ہے تیری" خالہ کو فوراً اعتراض ہوا۔

"او گاڈ" اس کی سرگوشی نصیبے نے سنی تھی۔ زور سے دروازہ بند کر کے جھٹکے سے آگے کا دروازہ کھولا۔

"بیٹھیے" اب کے آواز میں طنز تھا۔ وہ ڈری سہمی بڑی دبک کر بیٹھی۔ گوٹے کناری والا دوپٹہ ماتھے پر چپکا ہوا تھا۔ جس سے وہ کئی بار رومال کا کام بھی لے چکی تھی۔

"اچھا اماں۔ خدا حافظ" اس نے ماں کو لپٹایا۔

"رب کی امان میں" بچوں ثان کی آواز بھرائی۔

"میری بیٹی کو ستانا مت حیدر۔ تجھے اپنی ماں کی قسم ہے۔ پیار سے رکھنا اسے!"

وہ خاموشی سے گھوم کر آیا۔ اور دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ دھول اُڑاتے راستے پر نصیبے بڑی دیر تک مڑ مڑ کر خالہ کو ہاتھ ہلاتی رہی۔

لمبی سیاہ پکی سڑک پر گاڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ نصیبے ڈر ڈر کر کئی بار اس کی جانب دیکھ چکی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں سختی سے دبائے اچھے سے پر تھا اسا

تاثر لیے وہ ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ گھنگھریالے، سیاہ بالوں سے ہوا اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ اس طرح خاموش، ناراض، ناراض سا بیٹھا نصیبے کو اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مخاطب کر بیٹھی۔

"او جی۔ کتنی دور اور جانا ہے؟" (یہ ناراض ہیں تو کیا ہوا مجھے تو منانا چاہیے نا۔)

"خود دیکھ لینا۔" بڑی دیر بعد وہ بولا۔

گاڑی میں پھر خاموشی چھا گئی۔

"او جی۔ یہ گڈی آپ کی ہے؟" تھوڑی دیر بعد پھر اس کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"او جی۔ یہ گڈی میرے دوست کی ہے۔" دانت پیس کر جواب دیا گیا۔

"بائی دا وے یہ تکیہ کلام چھوڑ نہیں سکتیں آپ؟"

"کون سا تکیہ۔ جی؟" وہ خوفزدہ ہو گئی۔

"مائی گڈنیس۔" اس نے اسٹیرنگ پر مکا سا مارا اور ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

"نصیب میں جس کے جو لکھا تھا۔" رفیع کی آواز گاڑی میں گونجنے لگی۔ آواز اتنی تیز تھی کہ نصیبے کے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ وہ اپنا حسب حال گانا لگا کر اب قدرے آسودگی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ باقی کا تمام راستہ اس نے یہی گانا بار بار ری وائینڈ کر کے سنا۔ نصیبے بھی سر جھکائے ہاتھوں پر لگی مہندی کو نوچنے کی کوشش کرتی رہی۔ تا آنکہ گاڑی ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جا کر رک گئی۔

"اترئیے!" ایک نگاہ طنز اس پر ڈال کر وہ بولا۔

"وہ۔ جی۔ یہی اپنا گھر ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"جی ہاں، یہی "اپنا" گھر ہے۔" اس نے اپنا پر اس قدر زور دیا کہ وہ بالکل چپک گیا۔

وہ دروازہ کھول کر اتری اور دوسری طرف سے آکر اس کے لیے بھی دروازہ کھولا۔ اس کا لہجہ، رویہ، انداز، الفاظ اس قدر کھردرے تھے کہ وہ اپنے اندر بالکل چور بن گئی تھی۔ کسی کبوتری کی طرح سے سہمی ہوئی وہ گاڑی سے باہر نکلی۔

"اپنا گھر۔ ہونہہ، اپنا گھر۔"

اس کی زیر لب بڑبڑاہٹ میں سے چند الفاظ نصیبے کے کانوں میں بھی پڑے۔ کئی آنسو پھسل پھسل کر پلکوں کی منڈیر تک چلے آئے۔ اس نے نچلا ہونٹ سختی سے کاٹ کر انہیں واپس حلق سے اتار لیا۔ چھن چھن، چھن جلتے سلگتے دل پر نمکین پانی سے کئی چھناکے ہوئے۔ اور تمام آوازوں سے بے خبر دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ نصیبے نے چند گہرے گہرے سانس لے کر اپنی کیفیت پر قابو پایا اور اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ گھر چھوٹا مگر بے حد خوبصورت تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی کونے میں چھوٹا سا لان تھا۔ جس میں گلاب کے کئی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چھوٹا سا پورچ عبور کر کے اس نے مرکزی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ جب تک وہ چوکھٹ تک پہنچی اسپرنگ پر گھومتا دروازہ کھٹ سے آکر اس کی ناک سے لگا۔

"ہائے مر گئی۔" وہ گھٹی گھٹی چیخ مار کر وہیں بیٹھ گئی۔

"اوفوہ۔ کیا ہو گیا بھئی؟" صورتحال سے وہ کس قدر واقف تھا پھر بھی ہنسی ہونٹوں میں دبا کر پوچھا۔

"ناک پھوٹ گئی ہے جی۔" دل تو کسی اور وجہ سے بھرا ہوا تھا پھر بھی بروقت بہانہ ملنے پر وہ بات بنا کر زار و قطار رونے لگی۔

"ناک پھوٹنے پر رو رہی ہو! مجھے دیکھو قسمت پھوٹ گئی ہے۔"

وہ اچانک ہی ہنسنے لگا۔ نصیبے نے یوں کھلکھلانے پر حیرانی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک ہاتھ سے پیشانی تھامے، دوسرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، سرو قد صحت مند اور بے حد وجیہہ شخصیت کا مالک یوں زور زور سے ہنستا ہوا سیدھا اس کے دل میں اتر گیا۔

"ارے تمہاری ناک سے تو خون بہہ رہا ہے۔" وہ اچانک چونکا اور گھٹنے کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"نکسیر پھوٹ گئی کیا؟"

جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ نصیبے نے رومال سے پہلے آنسو صاف کیے پھر خون پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوری۔ مجھے خبر نہیں تھی تمہیں اتنے زور سے چوٹ لگی ہے۔" وہ اپنے ہنسنے پر شرمندہ ہوا۔

"اس سے پہلے دل، چوٹوں کی خبر ہو، آپ کو۔" اس نے دل میں سوچا۔

"چلو گھر دیکھ لو۔" وہ دائیں جانب ایک دروازہ کھول کر داخل ہوا۔ وہ بھی معمول کی طرح پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

بالکل چھوٹا سا کمرا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور بیچ میں شیشے کی میز۔ کونے میں رکھی کارنر ٹیبل پر نازک سے گلدان میں سرخ رنگ کے پھول سجے تھے۔ کھڑکیوں پر فان کلر کے بڑے خوبصورت پردے تھے۔

"او جی یہ بیٹھک ہے؟" نصیبے کو وہ چھوٹا سا پرسکون کمرا بہت پسند آیا۔

"آہو جی۔" وہ بالکل اسی کے انداز میں بولا۔

"چلیے اب اندر بھی دیکھ لیں۔" طنزیہ انداز چند لمحوں میں ہی پلٹ آیا تھا۔ اور وہ جو اس کے کچھ دیر قبل نرم پڑنے پر بڑی خوش ہو رہی تھی۔ اچانک ہی ٹھنڈی پڑ گئی۔

"پیر مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتے۔ پتا نہیں خالہ نے ایسا کیوں کیا؟" پہلی بار مایوسی کی بھرپور لہر اس کے اندر اٹھی۔ پھر سر جھٹک کر وہ دوبارہ اس کے پیچھے چل دی۔ کاریڈور میں بائیں جانب دو دروازے تھے پہلا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گئے۔

"او مائی گاڈ!" اندر کا نقشہ دیکھ کر بے اختیار حیدر کے منہ سے نکلا۔

چاروں دیواریں پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ پلنگ کے چاروں طرف بھی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ اور پورا بستر گلاب کی سرخ پتیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ نصیبے حیرت سے کھڑی آنکھیں پٹ پٹا رہی تھیں۔

"او جی۔ کس نے کیا یہ سب کچھ؟" وہ جو بے حد پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا ایک دم چونکا۔

"آں۔ کس نے کیا؟" بے خیالی میں وہ اسی کا سوال دہرانے لگا۔

"کس نے کیا، اوہ نو۔"

اس نے ہتھیلی پر مکا مارا اور پھر کمرے میں مارچ کرنے لگا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جانا شاید اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ نصیبے دم بخود کھڑی اسے گھور تی رہی۔ اور پھر اچانک ہی حیدر پر جیسے دورہ سا پڑا۔ وہ یکایک مڑا اور ساری بیلیں اور لڑیاں کھینچ کھینچ کر اتارنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں پاگلوں کی طرح اس نے ساری بیلیں نوچ ڈالیں۔ دیواریں جو چند لمحوں قبل کسی سہاگن کا سا روپ پیش کر رہی تھیں، اب اچانک ہی بیوہ کا روپ اختیار کر گئیں۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ پھولوں کو پاؤں تلے کچلنے کا عمل بھی شروع کر دیا۔ نصیبے کو اس وقت اس پر کسی پاگل کا گمان ہو رہا تھا۔ سانس روکے، آنکھیں پھاڑے وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ گلابوں کی جگہ اسے مستقبل میں اپنا چہرا نظر آ رہا تھا۔ جس شخص میں اس قدر غصہ بھرا ہو اس سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی تھی؟

تھوڑی دیر بعد جب وہ پسینہ پسینہ ہو گیا تو دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ہانپنے لگا۔

"ٹھیک۔ کوئی پریشانی ہے جی؟" بڑی کوششوں اور منتوں کے بعد وہ کس قدر باریک آواز میں پوچھنے کے قابل ہوئی۔

اس نے سرخ انگارا نگاہیں اٹھائیں، چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اچانک ہی چیخا۔

"ساری پریشانی، تمہاری صورت سے ہے، تم ہو!"

وہ سہم کر پیچھے ہٹی اور اس کی پشت دھڑ سے جا کر دیوار سے ٹکرائی۔ وہ تنتناتا ہوا اس کے قریب سے گزر کر باہر چلا گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے، دیوار سے لگی کھڑی رہ گئی۔ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح سے کھڑی رہتی کہ بیل کی آواز پر ایک ہلکی سی چیخ مار کر حواسوں میں آ گئی۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز سن کر شاید حیدر باہر گیا تھا۔ کیونکہ اس کے قدموں کی چاپ، دور ہوتی سنائی دی تھی پھر اچانک ہی قہقہوں اور باتوں کا ایک شور سا اندر آیا۔

"ابے سالے۔ اتنے چپکے سے نکاح پڑھوا کر آیا ہے کہ کیا کوئی کسی کو بھگا کر لائے گا۔ یعنی ہمیں تو تو نے کاٹھ کا الو سمجھا تھا نا؟" کسی مرد کی بڑی بے تکلفانہ آواز تھی۔

"نہیں یار مجھے اچانک ہی جانا پڑ گیا تھا میں وسیم کو بتا کر گیا تھا۔" حیدر کی آواز قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔

"ارے وسیم یاروں کا یار ہے۔ اسی وقت پورے آفس کو یہ خوشخبری سنا دی تھی اس نے۔ اچھا یہ بتا کمرا پسند آیا؟ قسم لے لے پورے دو دن کی محنت ہے۔"

"ابے یار ہم لوگ بالکل ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ابھی تو اس نے ٹھیک سے پورا گھر دیکھا بھی نہیں!"

"اور ہماری بھابی کیسی ہیں؟"

"اب یہ کہے گا ابھی تو میں نے ٹھیک سے دیکھا بھی

نہیں!" حیدر کے بجائے کسی شوخ آواز نے کہا اور ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

"اچھا تو تم لوگ یہاں کاریڈور میں کیوں کھڑے ہو۔ چلو ڈرائینگ روم میں چلو نا!"

"پہلے بھابی کا دیدار کراؤ!" کسی نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"اچھا اچھا تم چلو تو سہی!" وہ غالباً انہیں دھکیل رہا تھا۔

"بھابی۔ بھابی جان۔ ذرا تشریف لے آیئے!" یہ حیدر کا کچھ زیادہ ہی شوخ سا دوست تھا جس نے بیڈروم کی جانب منہ کر کے ہانک لگائی تھی۔

نصیبے نے گھبرا کر دوپٹہ سر پہ اوڑھا۔ اور باہر نکل آئی۔ کپکپاتے ہوئے قدموں سے وہ آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی۔

"سس۔ بیٹھیے۔ جی۔ میں آؤں کیا؟" اس کی بڑی مہین سی آواز نکلی تھی مگر اچانک ہی اندر سے آتی شور وغل کی آوازیں تھم گئیں۔

"اسے بلانا۔!" کسی دوست نے غالباً گم سم حیدر کو ٹہوکا دیا ہوگا۔

"آں۔ ہاں!" اس نے تھوک نگلا۔

"آ۔ آجاؤ نا!"

"ارے یہ ہمارا دوست تو پہلے دن ہی گیا!"

اسی منچلے نے دوبارہ شرارت سے کہا اور سب ہنسنے لگے۔ اور پھر اچانک ہی سب کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ نظریں جھکائے ماتھے کو دوپٹے سے آدھا ڈھانپے ہوئے وہ اندر آ رہی تھی۔ گاؤں سے چلتے ہوئے ہی اس کا حلیہ اس قدر خراب ہو رہا تھا۔ اور اب مزید خراب ہو کر بڑی ڈراؤنی شکل اختیار کر چکا تھا۔ چمکتے گہرے زرد رنگ کے سوٹ میں وہ اس وقت کوئی کارٹون لگ رہی تھی۔ اس پر چوٹ کھائی اچھی خاصی ستواں ناک بھی پھول کر غبارہ بن چکی تھی۔ جس قدر میک اپ بھی اس نے کیا تھا۔ وہ اب آنسوؤں اور پسینے کے سیلاب سے کیچڑ بن چکا تھا۔

"مم۔ میں۔ تم لوگوں کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں!" ان لوگوں کا پہلا تاثر اور نصیبے کی شکل دیکھنے کے بعد حیدر کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ نظریں چراتا ہوا تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"سلام جی!" اس کے جانے کے بعد نصیبے نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر ان سب کو سلام کیا۔

"آپ۔ بیٹھیے نا بھابی!" اچانک ان میں سے کوئی ہوش میں آیا۔ نصیبے نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ اور چاروں حیدر ہی کے ہم عمر تھے۔ وہ چپ چاپ کونے والے صوفے پر ٹک گئی۔

"کک۔ کیسی ہیں آپ؟" ان میں سے ایک نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ٹھیک ہوں جی!" وہ آہستگی سے بولی۔

"کب۔ کب آئے آپ لوگ؟" پھر کسی نے اٹک کر پوچھا۔

"ابھی پہنچے ہیں جی!" وہ پھر بول کر خاموش ہو گئی۔

وہ چاروں بھی اچانک ہی خاموش ہو گئے تھے۔ جس وقت حیدر چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ وہ سب اس طرح چپ تھے جیسے کسی جنازے پر آئے ہوں۔

"تم جاؤ اندر!" ٹرے میز پر رکھتے ہوئے وہ اس سے بے حد آہستگی سے بولا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر اندر آ گئی۔ اس کی طبیعت سخت مکدر ہو رہی تھی۔ باہر آ کر اس نے آہستہ آہستہ سارے گھر کا جائزہ لے ڈالا۔ اس بیڈروم کے علاوہ ایک چھوٹا سا کمرا اور بھی تھا۔ جسے فی الوقت اسٹور کا نام دیا جا سکتا تھا۔ ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے آخر میں کچن تھا۔ اٹیچڈ باتھ دونوں کمروں کے درمیان تھا۔ اور دونوں کمروں میں کھلتا تھا۔ اس وقت وہ جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے تھکن محسوس کر رہی تھی۔ منہ دھونے کی غرض سے وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ لائٹ کھول کر جیسے ہی وہ واش بیسن کے سامنے کھڑی ہوئی اس کی نگاہ بے اختیار سامنے لگے آئینے پر پڑی۔

"اوں!" حیرت سے اس کے منہ سے نکلا۔ چند لمحے وہ ٹکٹکی باندھے اپنے عکس کو گھورتی رہی اور پھر بے اختیار ہی اس کی ہنسی نکل گئی۔ اپنا اس قدر بدصورت عکس وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ یونہی ہنستی رہی پھر نل کھول کر منہ دھونے لگی۔

وہ شام کو سو کر اٹھا تو وہ نہا دھو کر کپڑے بدل چکی تھی۔ پھولدار نیلا سوٹ پچھلوں کے مقابلے میں نسبتاً بہتر لگ رہا تھا۔ اور دوپٹے پر چمکدار گوٹے کے بجائے سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ چائے لیے اس کے سرہانے

سر جھکائے کھڑی ہوئی وہ اس کو کافی بہتر کنڈیشن میں نظر

"او جی۔ یہ چائے!"

"اف۔ مگر یہ تمہارا تکیہ کلام!" وہ اچانک ہی مایوس ہوا۔

"کیا کیا نظر انداز کروں گا؟ اماں جی، اولاد کے مقابلے میں بھانجی کو اس قدر ترجیح!"

"ہاں ٹھیک ہے رکھ دو!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی کہ شاید وہ "بیٹھ جاؤ" کہنے کی زحمت گوارا کرے۔ مگر جب وہ مہر بلب رہا تو وہ واپس پلٹ گئی۔ حیدر نے ایک نگاہ بے نیاز اٹھائی اور پھر جھکانا بھول گیا۔ اس کے بال جیسے اندھیرا سا چھا گیا کمرے میں۔ گھٹنوں تک سیاہ گھنے، چمکیلے بالوں کی آبشار سی بنی ہوئی تھی۔ کسی لڑکی کے حوالے سے اس کی پسندیدہ خصوصیت لمبے بال تھے۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے اپنی تمام زندگی میں اس قدر حسین بال نہیں دیکھے تھے۔ جب تک وہ دروازہ کھول کر باہر نہیں چلی گئی تب تک دو اسے یونہی جاتا دیکھتا رہا۔

"کیا حسین بال ہیں!" اس نے پہلی بار اس کی کسی چیز کو سراہا۔ اور پھر چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

دوسرے دن وہ صبح اٹھ کر آفس چلا گیا تھا۔ رات کو جب وہ اپنے بیڈروم میں لائٹ بجھا کر سو گیا تھا تب نصیبے چپ چاپ دوسرے اسٹور نما کمرے میں ایک دری بچھا کر سو گئی تھی۔ جب قسمت میں ایسا ہی لکھا ہے تو یونہی سہی! اس نے چپ چاپ دل کو تسلی دے ڈالی تھی۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ وہ ایک چھت کے نیچے تھی۔ ایک مضبوط سہارے کے ہمراہ تھی۔

دوسرے دن وہ اسے جگا کر باورچی خانے میں آ گئی تھی۔ اسے انڈا پراٹھا اور چائے بنا کر دی تھی۔ اور وہ خاموشی سے ناشتا کر کے چلا گیا تھا۔ اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے جھاڑو سنبھالی اور گھر کی صفائی میں مصروف ہو گئی۔ تین چار دن سے صفائی نہ ہونے کے باعث گھر کافی گندہ ہو رہا تھا۔ جھاڑو لگا کر پوچا پھیرنے میں اسے کافی دیر لگ گئی۔

اس کے بعد وہ کچن میں آ کر ڈبوں کی تلاشی لینے لگی۔ ضرورت کی تقریباً تمام اشیاء موجود تھیں۔ اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد دال چاول بنا لیے۔ سلاد کے لیے وہ پیاز کاٹ رہی تھی کہ بیل بج اٹھی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو وہ گاڑی اندر لے آیا۔

"سنو۔ ذرا اپنے کپڑے دکھاؤ!" اندر آ کر وہ اس سے بولا۔

"جی۔ دیکھ لیں۔!" اس نے دوپٹہ ٹھیک کر کے دامن جھاڑا۔

"ارے یہ نہیں۔ وہ جو ساتھ لائی ہو اس لوہے کے ٹرنک کو بھر کے۔ وہ دکھاؤ!"

"آئیں جی۔!" اس نے بھاگم بھاگ اپنا ٹرنک گھسیٹ کر نکالا۔

"دیکھیں جی۔ کون سے چاہئیں!"

"فی الحال تو میری جنس تبدیل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے!" وہ چڑ گیا۔

"آئندہ کی خبر نہیں۔ میں تمہارے لیے ہی دیکھ رہا ہوں!"

"میرے لیے؟ کیا مطلب؟"

"مطلب؟ اوہ اچھا۔ مطلب یہ کہ میرے دوست آ رہے ہیں ٹریٹ لینے کے لیے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے سامنے کوئی بے حد شوخ جوڑا پہننے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اور ذرا سی سوبر نظر آئیں!" وہ جلے کٹے لہجے میں کہہ کر ٹرنک کھنگالنے لگا۔

بات یوں تو اس کے سر سے گزر گئی پھر بھی وہ خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھتی رہی۔ ایک ایک کر کے اس نے سارے کپڑے باہر ڈھیر کر دیے پھر بڑے تاسف سے اس ڈھیری کو گھورنے لگا۔

"کوئی بھی پسند نہیں آیا جی؟" اس نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

"نہیں نہیں کیا بات ہے ان کی۔ بڑی بڑی ہیروئنیں محروم ہیں ان قیمتی ملبوسات سے!" وہ بولا اور پھر سر جھٹک کر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ وہ حیرانی سے اس پل میں تولہ، پل میں ماشہ شخص کو دیکھتی رہی۔

"خیر کوئی بات نہیں!" وہ کہہ کر مڑا اور ذرا سا نزدیک آ کر بغور اس کو گھورنے لگا۔

اس کارروائی پر وہ یک دم بوکھلا کر دوپٹے سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگی۔

"ہٹاؤ یہ دوپٹہ۔" وہ یکایک سختی سے بولا۔ نصیبے نے گھبرا کر ہاتھ گرا لیا۔

"ہوں، ٹھیک ہے۔" اچھی طرح اس کے نقوش کا معائنہ کرنے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہو کر بولا۔

"بال دکھاؤ۔"

"جی؟"

"ادھر آگے کرو بال۔!" نصیبے نے جھٹ چٹیا آگے کر لی۔

"کیا کھاد ڈالتی ہو بالوں میں؟" چٹیا کی لمبائی و موٹائی دیکھ کر وہ مسکرا کر بولا۔

"نہیں جی، کھاد کیوں ڈالوں گی؟" وہ بڑی حیران ہوئی۔

"تمہارا بھروسا نہیں اس لیے پوچھ لیا۔" وہ ہنس دیا۔

"کچھ پکایا ہے؟"

"ہاں جی۔ دال چاول پکائے ہیں۔" وہ فوراً بولی۔

"نکالوں؟"

"ہاں میں ذرا منہ دھولوں۔" وہ کہتا ہوا باتھ روم کی جانب مڑ گیا۔

اگلے دن وہ ناشتا کرنے کے بعد بیٹھا اخبار پڑھتا رہا تو اسے قدرے حیرت ہوئی۔

"او جی۔ دفتر نہیں جانا آپ نے؟"

"نہیں۔ کل بتایا تو تھا کہ چھٹی ہے آج۔" اس نے اخبار پرسے سر اٹھایا۔ تھوڑی دیر اس کی احمق شکل کو گھورتا رہا۔

"دعوت ہے آج دوستوں کی۔" پھر وضاحت کی۔

"اپنے گھر؟"

"ہاں یہاں اپنے گھر۔" وہ مسکرا دیا۔ (اس کی مسکراہٹ بھی کافی طنزیہ ہوتی تھی۔)

"او جی۔ پھر کوئی انتظام شنتظام بھی تو کریں!"

"بات سنو۔" اس کی بات کے جواب میں وہ اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"سنا ئیں جی!"

"ایک بات مانو گی۔"

"حکم کریں جی!" اس نرم لہجے پر وہ ایک دم پگھل گئی۔

"اپنا تکیہ کلام چھوڑ دو۔" وہ بڑی بیزاری و عاجزی سے بولا۔

"یہ اگر ہر بات کا آغاز "او جی" سے نہ بھی کرو تو کوئی حرج ہے؟"

وہ اسے چند لمحے تکتی رہی پھر بات اس کے پلے پڑ گئی۔

"اوہ۔ اچھا جی۔ کوشش کروں گی جی۔"

"پھر وہی۔ جی۔ جی۔ وہی رٹ۔ یہ جی کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا تمہیں؟"

"اچھا جی۔ نہیں جی۔ وہ۔ اب۔ نہیں بولوں گی جی۔!" اس کے گھورنے پر وہ بڑی بے بسی سے بولی، اور حیدر نے سر تھام لیا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"سنو اب تم جلدی سے نہا لو۔"

"وہ لوگ آنے والے ہیں؟" پلیٹیں اٹھاتے ہوئے وہ چونکی۔

"نہیں، انہوں نے تو رات میں آنا ہے۔ ابھی تمہیں لے کر چلنا ہے۔"

"کہاں؟"

"ہے ایک جگہ۔ سوالات مت کرو۔ جا کر نہا لو۔ اور سنو یہ ایک من بدبودار قسم کا جو تیل لگا رکھا ہے۔ اسے اچھی طرح سے نکالنا۔ دو مرتبہ شیمپو کرنا۔ سمجھیں؟"

"ہاں۔!"

"کیا ہاں؟"

"سمجھ گئی۔!"

"تو "جی" نہیں بولا جاتا، پر "ہاں" کیا ہوتا ہے؟"

"آپ ہی نے تو منع کیا ہے نا!" وہ بے چارگی سے بولی۔

"پھر جی کیسے بولوں؟"

"اچھا اچھا!" اسے ہنسی آگئی۔

"زیادہ مظلوم مت بنو۔ اور نہا لو جا کر۔"

"اچھا جی۔" وہ کھڑی اور پھر گھبرا گئی۔

"نہیں، نہیں صرف اچھا۔!" اور وہ اس کی اس حرکت پر ہنستا ہی چلا گیا۔

اس روز نہانے میں اس نے اپنی پوری جان صرف کر ڈالی۔ آدھا صابن خرچ کر کے وہ باہر نکلی تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اچھی طرح اپنا جائزہ لیا۔

"ہوں! اب کچھ گوری ہوئی ہوں!" وہ قدرے مطمئن ہوئی۔ اس وقت اس نے ہرے رنگ کا بالکل سادہ لان کا سوٹ پہنا تھا۔ کیونکہ حیدر کے انداز سے اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے چھبتے ہوئے رنگ اور ریشمی کپڑے پسند نہیں ہیں۔ بالوں میں کنگھا کر کے اس نے آگے پیچھے ہو ہو کر کئی بار اپنا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر باہر آگئی۔

"میں نہا کر آگئی ہوں جج۔ جی۔" زبان، زبان تھی پھسل گئی۔

حیدر نے اخبار پرسے نظریں اٹھائیں اور سر سے پاؤں تک اس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔

"ہوں۔" سر ہلا کر اس نے گھڑی پر نظر دوڑائی، چار بج رہے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ چلو چلتے ہیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"کہاں پر؟" وہ الجھی۔

"جہاں میں کہوں وہاں پر۔" وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی رسٹ واچ اٹھا کر باندھنے لگا۔

"اچھا۔!" وہ چپ ہو گئی۔

"چلو آجاؤ۔" چابیاں اٹھا کر وہ باہر کی طرف چل پڑا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے چل دی۔ گاڑی میں بیٹھ کر بھی وہ کچھ نہیں بولا، خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ نصیبے نے بھی پھر کچھ نہیں پوچھا۔

"جہاں لے جاتے ہیں، لے جائیں۔" اس نے ذہنی طور پر تنگ آکر سوچا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے گاڑی ایک دکان کے سامنے روکی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" نصیبے نے باہر جھانکا۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں سے تم ایک بدلی ہوئی شخصیت لے کر باہر آؤ گی۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"چلو اترو۔"

وہ چپ چاپ اتر آئی۔

اندر تین چار خواتین موجود تھیں۔ چاروں طرف لگے دیوار گیر آئینوں کو وہ حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"یہ میری وائف ہیں۔" وہ ایک موٹی سی عورت سے کہہ رہا تھا۔

"ان کا پارٹی میک اپ کر دیجیے۔ بالوں کا بھی کوئی اچھا سا اسٹائل بنا دیں۔ میں ذرا ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد پک کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اطمینان سے جائیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تھینک یو۔" وہ مڑ کر باہر نکل گیا۔ نصیبے کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"آئیے۔ آپ ادھر آجائیں۔" وہ اسے لے کر دوسری طرف آگئی۔

اور ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد جب وہ اسے لینے آیا تو وہ آئینے میں خود کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ آگے کی بیک کومبنگ اس کے چہرے پر بے حد سوٹ کر رہی تھی۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ نے واقعی اس کے چہرے کو بالکل نیا رنگ دے دیا تھا۔ حیدر نے پے منٹ کرنے کے بعد اس کو ایک نظر دیکھا۔ اور چلنے کا کہہ کر باہر آگیا۔

کار میں بیٹھنے کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”گڈ! “ستائش لہجے میں کہا گیا اس کا یہ ایک لفظ نصیبے کو بے حد خوش کر گیا۔

”میں اچھی لگ رہی ہوں نا؟“

”میں نے کب کہا؟“ اس نے مسکراہٹ لبوں میں چھپائی۔

”ابھی جو کہہ رہے تھے۔“

”کیا کہہ رہا تھا؟“

”کہ گوڈ لگ رہی ہوں۔“ وہ شرمائی۔

وہ اتنی زور سے ہنسا کہ وہ اچھل کر چپ ہو بیٹھ گئی۔ وہ تا دیر ہنستا رہا۔ ناراض ہو کر اس نے رخ موڑ لیا۔

”ہونہہ۔ یہ تو ہمیشہ مخول کرتے ہیں۔“ اس نے سوچا۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ اسے کھانے کے سامان کے پیکٹ تھماتے ہوئے بولا۔

”جلدی جلدی سارا سامان کچن میں لے کر چلو ابھی پلیٹیں وغیرہ بھی لگانی ہیں۔“

”بہت سارے لوگ آئیں گے کیا؟“ وہ سامان تھامتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ چار پانچ دوست ہیں بس۔ بہرحال انتظام تو اچھا سلیقے کا ہونا چاہیے نا!“

”آپ فکر ہی نہ کریں میں ابھی سب کچھ کر لوں گی۔“

”جلدی کرو۔ ابھی کپڑے بھی چینج کرنے ہیں تم نے۔“

”کپڑے کون سے پہنوں؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”لایا ہوں میں۔ تم فکر مت کرو۔ اور کام کرو۔“ اسے ڈانٹ کر وہ بقیہ سامان اٹھائے اندر آ گیا۔

کافی دیر تک وہ اسے ڈانٹ ڈانٹ کر سارا کام سمجھاتا اور کرواتا رہا۔ کچن سے کمرے، اور کمرے سے کچن تک کی دوڑ لگا کر وہ تھک گئی۔ تب کہیں جا کر اس کی تسلی ہوئی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ چلو تم کپڑے بدل لو اندر کمرے میں رکھے ہیں۔“

وہ بڑی بے تابی سے اندر آئی۔ بیڈ پر رکھے ہوئے ڈبوں کو اس نے جلدی جلدی کھولا۔ شاکنگ پنک شیفون کا کرتا دوپٹہ تھا جس پر سلور نازک سا کام تھا۔ گلے اور آستینوں پر کام کے علاوہ پورے سوٹ پر مقیش بھی کی ہوئی تھی۔

اتنا خوبصورت سوٹ دیکھ کر وہ بڑی ایکسائیٹڈ ہوئی۔ دوسرے ڈبے میں سلور کورٹ شوز تھے۔ چھوٹی سی لڑی اور پنسل ہیل کے انتہائی نازک جوتے تھے۔ ہیل سے ذرا اوپر چھوٹی سی لڑی ہوئی تھی اتنی خوبصورت چیزیں تو اس نے اپنی ساری زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ خوشی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے جلدی سے جا کر کپڑے بدلے۔ باہر آ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ بڑی محویت سے اپنے عکس کو تک رہی تھی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ کب سے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا سینے پر دونوں ہاتھ باندھے وہ اسے بغور آئینہ دیکھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”شیشہ دیکھنے میں بس ایک منٹ ہے اب۔ بس بھی کرو۔“ بالآخر وہ بولا تو وہ چونکی۔

”اوہ۔ وہ جی۔“ وہ شرما گئی۔

”گولی مارو اس ”جی“ کو۔ جوتے کیوں نہیں پہنے؟“

”پہنتی ہوں ابھی۔“

وہ جلدی سے بیٹھ کر جوتے پہننے لگی، جوتے قدرے چھوٹے تھے۔ پھر تو بہرحال اس نے ڈال ہی لیے۔ مگر پھر کھڑے ہو کر چلنا اس سے محال ہو گیا۔

”اُف۔ اللہ۔ اوئی۔“ ہر قدم پر گھبرا کر اس نے ایک ایک لفظ ادا کیا۔

”کیا ہوا؟“

”یہ تو بہت کاٹتے ہیں۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”اچھا۔“ وہ پریشان ہوا۔

”خیر اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ بازار کافی دور ہے۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”اب تو ایسے ہی کام چلانا ہو گا۔“

”میں اپنے پرانے جوتے پہن لوں۔“ درد ناقابل برداشت تھا۔

”کیا؟ خبردار جو ان ہزار ہا پٹیوں والے خطرناک قسم کے کھڑاؤں کا ذکر کیا تو۔ بس ذرا سی دیر چلو گی تو پریکٹس ہو جائے گی۔ اور زیور کیوں نہیں پہنا؟“

”زیور؟ وہ اپنا سونے کا سیٹ؟“

”جی نہیں۔ وہ ایک ایک انچ تک گردن میں دھنسا ورقی سیٹ پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو لایا ہوں۔

کہاں گیا؟“ اس نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں، پھر بیڈ پر رکھا ہوا تیسرا چھوٹا سا ڈبہ اٹھایا۔

”چلو پہنو۔ میں ذرا چینج کر لوں جب تک۔“ ڈبہ اسے تھما کر وہ باہر نکل گیا۔

اس نے ڈبہ کھولا۔ سلور نگوں والا کندن کا گلوبند اور کندن ہی کے سہاروں والے بندے تھے۔ چند لمحوں کے لیے وہ پیروں کی تکلیف کو بھول گئی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گلوبند پہننے لگی۔ بندے بھی اس نے پہن لیے مگر سہارے لگانا اسے قطعی نہیں آیا۔ جس وقت وہ کپڑے بدل کر آیا وہ سہاروں سے الجھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ وہ اس کے پاس آیا۔

”یہ۔ ان کا کیا کروں؟“

”ان کا اچار ڈال لو اور آج کھلا دو مہمانوں کو۔“

وہ ہنسا اور پھر اس کے پاس آ کر اس کے بالوں میں سہارے لگانے لگا۔ اس کی شرٹ میں سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو اور اس کا وجیہہ سراپا اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔ خود بخود اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ جانے کتنی دیر ہوئی کئی لمحے گزرے، وہ یونہی آنکھیں بند کیے کھڑی رہی۔ بہت دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ کمرے میں اکیلی ہی کھڑی تھی۔ چاروں طرف اس کی خوشبو کے درمیان تنہا کھڑی وہ خود کو ہی اچھی لگنے لگی۔ اور اس کا دل چاہا کہ وہ ساری عمر اس مہکتی فضا میں ایسے ہی کھڑی رہے۔ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آئی۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔ اگر اس کو سوتے میں کوئی اس طرح تیار کر دیتا۔ اور جاگ کر وہ آئینہ دیکھتی تو شاید یہی سمجھتی کہ وہ کوئی تصویر دیکھ رہی ہے۔ قطعاً نہ پہچان پاتی وہ اپنے آپ کو۔

”ابھی تیاری مکمل نہیں ہوئی کیا؟“ وہ اندر آیا تو نصیبے نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ نیوی بلیو ڈنر سوٹ میں وہ اس قدر اچھا لگ رہا تھا کہ سامنے کھڑی نصیبے کی ساری تیاری اچانک ہی ماند پڑ گئی۔ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی اس کی بوسیدہ جھولی میں آسمان کا چاند آ گرا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اسے اپنی جانب یوں تکتا پا کر وہ حیران ہوا۔

”مہمان نہیں آئے؟“ وہ افسردگی سے مسکرا کر بولی۔

”آنے والے ہیں۔ چلو آ جاؤ تم بھی۔“ وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ڈرائنگ روم کی سیٹنگ اس نے آج کے دن کے لیے تھوڑی سی تبدیل کر لی تھی۔ تھوڑی دیر بعد باہر ہارن بجا۔ حیدر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اور ان لوگوں کو لے کر اندر آیا۔

”یہ بھابی؟ السلام علیکم بھابی!“ کل جو دوست اس سے مل کر گئے تھے۔ انہیں بڑی خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی۔

”وعلیکم السلام جی!“ وہ شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ آنے والوں میں ایک خاتون بھی شامل تھیں۔ ڈیپ ریڈ کلر کی ساڑھی کے بارڈر پر ستاروں کی پٹی لگی تھی۔ شانوں تک کٹے سلکی شہد رنگ، بالوں کو اس نے آگے سے کلپ کر رکھا تھا۔

”ہیلو ڈارلنگ۔ ہاؤ آر یو؟“ نصیبے کے گال پر بوسہ دے کر اس نے بڑی ادا سے پوچھا۔

”جی!“ وہ اس حرکت پر بوکھلا سی گئی۔

”یہ رشنا ہے۔“ حیدر نے بروقت پہنچ کر اس کی مدد کی۔

”میری کولیگ ہے۔ اور رشنا یہ نصیب ہے۔“

”بڑی ہی خوش نصیب ہے۔“ وہ بڑی ادا سے مسکرا کر بولی۔

”ہم سے صاف بچا کر لے گئی نا تمہیں!“

”ارے آپ کی زلفوں کے جال میں جو ایک بار پھنسے وہ پھر نکل سکتا ہے۔“ حیدر زور سے ہنسا۔

”نائی بوائے!“ اس نے حیدر کے شانے پر ہلکا سا مکا مارا اور خود بھی ہنسنے لگی۔

نصیبے نے قدرے ناگواری سے یہ منظر دیکھا اور وہاں سے ہٹ گئی۔

حیدر کے دوست اونچے اونچے قہقہے لگا رہے تھے۔ سب سے زیادہ وہی عورت ہنس رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ حیدر۔ دونوں آپس میں مگن جانے کیا کیا باتیں کر رہے تھے۔ نصیبے وہاں سے ہٹ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

”ہونہہ آئی بڑی۔ بڑا حسین سمجھ رہی ہے۔ گٹ مٹ کر کے خود کو۔“ اس نے جل کر سوچا۔

”کیا ہے اس میں۔ پھر کٹی ہے، اور ساڑھی باندھی ہے بس۔“ وہ رشنا کا جائزہ لے کر سوچتی رہی۔

”نصیبے، ابھی کھانا لگاؤ۔ ان لوگوں کی آنتیں باہر

نکل آئیں۔" حیدر کو بڑی دیر بعد اس کا خیال آیا۔

"پورا نام کیوں نہیں لیتے میرا۔ سب کے سامنے تو بڑے پیار سے بولتے ہیں۔ دو جملے کہیں گے؟" اسے حیدر پر بھی غصہ آرہا تھا۔

سب کچھ تیار ہی تھا۔ اس نے ڈشیں لاکر رکھ دیں تو وہ سب واقعی بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

"بھئی حیدر، لگتا ہے تمہاری وائف کو کوکنگ سے دلچسپی نہیں ہے۔ ساری چیزیں بازاری ہیں۔" رشنا نے ناک چڑھا کر کہا۔

"بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں نئی نویلی دلہنوں سے اتنا کام نہیں کرواتے۔" وہ مزے سے بولا۔

"ورنہ کھانا پکانا اسے سب آتا ہے۔"

"رئیلی؟" وہ نصیبے کی جانب دیکھ کر بولی۔

"کیوں بھئی نصیب جی، کیا کیا بنالیتی ہیں آپ؟"

"جی؟" جانے کیوں اس کے مخاطب کرنے سے وہ نروس ہو جاتی۔

"سب کچھ ہی پکانا آتا ہے مجھے تو۔"

"کہیں ہمارے حیدر کا دل نہ پکا دیجیے گا۔" اس نے پھر ادا دکھائی۔

"ہمارے حیدر۔" کھٹ سے جاکر یہ لفظ اس کے دل پر لگے۔

"بھئی اب ایسے مت پکارو۔ ان کے جملہ حقوق بحق مسز نصیب حیدر محفوظ ہو چکے ہیں۔" حیدر کے کسی دوست نے اس کے دل کی پکار سن لی۔

"ہاں۔" اس نے شوق سے آہ بھری۔

"آہستہ آہستہ ہی عادت پڑے گی نا۔"

اور سب زور سے ہنس دیے۔

"بھابی جی، اب آپ آگئی ہیں ناں تو خوب خرچہ کروائیے گا اس کنجوس کا۔" حیدر کا دوست آفاق اس سے مخاطب ہوا۔

"یہاں سے بھابی! اتنا کچھ جمع کر کے بیٹھا ہے نا اور خرچ کرنے سے جان جاتی ہے۔ اس کی ابھی شادی سے مہینہ بھر پہلے اسے کہہ کہہ کر قسطوں پر گاڑی دلوائی ہے، یہ گھر بھی سال بھر پہلے ہی لیا ہے۔ اس نے، اتنا کہہ سن کر۔ ورنہ تو اتنے چھچھر فلیٹ میں رہتا تھا جسے ڈربا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

"اچھا اچھا بس۔" حیدر نے اسے گھورا۔

"آستین کے سانپ۔ زیادہ بی جمالو بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا کرے بیچارا، اپنی عادت سے مجبور ہے۔" رشنا ہنسی۔

"لیکن تم فکر مت کرو۔ مسز نصیب شکل سے کافی معصوم نظر آتی ہیں۔ اس کی باتوں میں آنے والی نہیں ہیں۔" نہ جانے اس کے دماغ میں کون سا لفظ تھا جس کی جگہ اس نے معصوم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ حیدر کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

"اچھا بھئی، اب اجازت۔" وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو بھی، چائے کا ایک دور اور ہو جائے۔"

"نہیں نہیں پھر کبھی سہی۔" رشنا نے اپنی نازک سی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ "پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"چلو نکلو پھر۔" آفاق بولا۔ "ابھی ان سب کو میں نے ڈراپ بھی کرنا ہے۔ ساتھ آنے کا پروگرام بنا کر میری پتلی گردن پھانسی ہے انہوں نے۔"

"بھابی، آپ کے لیے ہم سب کی طرف سے۔" حیدر کے ایک کافی کم گو دوست لیاقت نے ایک چھوٹا سا ڈبہ اس کی جانب بڑھایا۔

"یہ، یہ کیا ہے جی؟" وہ گھبرائی۔

"لے لو۔" حیدر نے آہستگی سے کہا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر گفٹ لے لیا۔ وہ دونوں انہیں چھوڑنے گیٹ تک گئے۔

"ہائے مر گئی میں تو۔" جیسے ہی ان لوگوں کی گاڑی آگے بڑھی، وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

"ارے، ارے کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر پلٹا۔

"پیر دکھ گئے ہیں۔" رونی صورت بنا کر اس نے اپنے پیر دکھائے۔ تین چار گھنٹے ملے تک وہ جس صبر آزما دور سے گزری تھی یہ وہی جانتی تھی۔ اب تو پیروں میں جیسے انگارے سے دہک رہے تھے۔

"اوہ۔" اس نے گہرا سانس کھینچا۔ "شکر ہے ان لوگوں کے سامنے یہ حرکت نہیں کر دی۔"

"ان کے سامنے ہی ایسا کرنا ہوتا تو اتنی دیر تک تکلیف کیوں برداشت کرتی۔" وہ ناراض ہوئی۔

"اچھا چلو، اب اندر آجاؤ۔" وہ مڑ کر اندر چلا گیا۔

"ہونہہ۔ پھر بن گئے پہلے جیسے۔" وہ وہیں بیٹھی تلوے سہلاتی رہی۔

کچن میں بیٹھی وہ سالن پکانے کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی، جب دروازے کی بیل بجی۔

"اس وقت ہی آگئے کیا؟" اس نے سوچا۔

"ابھی تو ان کے آنے میں کافی دیر ہے۔" سوچتی ہوئی وہ ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے ہاتھ سے آنکھوں کا پانی صاف کرتی ہوئی گیٹ تک آئی۔

"جی، کس سے ملنا ہے جی؟" گیٹ پر کھڑی خاتون اور ان کے پیارے سے بچے کو دیکھ کر اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ملنا تو تم سے ہی ہے۔" وہ مسکرائیں۔

"میں پڑوسن ہوں تمہاری، سامنے والے گھر میں رہتی ہوں۔"

"اوہ۔ اچھا۔ آئیں نا پھر۔" وہ ایک طرف ہٹی۔

"باہر کیوں کھڑی ہیں؟"

"السلام وعلیکم آنٹی۔" نو دس سالہ بچے نے اسے بڑے احترام سے سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔

"میرا نام حسن ہے۔"

"بڑا اچھا نام ہے آپ کا۔" نصیبے نے پیار سے بچے کا گال سہلایا۔ اور انہیں لے کر اندر آگئی۔

"آپ بیٹھیں جی۔ میں ابھی آئی۔" انہیں بٹھا کر وہ جلدی جلدی کچن میں آئی۔ ہاتھ دھو کر ان لوگوں کے لیے شربت بنایا۔ اور ٹرے میں گلاس سجا کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"ارے یہ تکلف کیوں؟ میں تو یونہی تھوڑی دیر کو آگئی تھی۔"

"آپ کا اپنا گھر ہے جی، چاہے روز آئیں۔" وہ مسکرائی۔

"پڑوسیوں کا تو بڑا حق ہوتا ہے۔"

"میرا نام ساجدہ ہے۔" انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

"تمہارے لان سے جس گھر کی بالکنی نظر آتی ہے نا وہی میرا گھر ہے۔ کئی دن سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ سوچا نئی آئی ہو، کسی شے کی ضرورت نہ پڑے۔ اسی لیے چلی آئی۔"

"بڑا اچھا کیا جی۔ مجھے اب کوئی مشکل ہوئی تو آپ ہی کے پاس آؤں گی۔"

"کب ہوئی تمہاری شادی؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"مہینہ ہونے والا ہے جی۔" وہ خود بخود افسردہ سی ہو گئی۔

"بس اتنے سے دن؟ اور شکل ایسی بنا رکھی ہے جیسے کئی سال گزر گئے ہوں۔ ذرا سج سنور کر رہا کرو بھئی۔"

"بس جی بلیجے اداس ہوتی۔"

"ان کو پسند ہی نہیں ہے نا میرا سج سنور کر رہنا۔ ان کو اصل میں سادگی پسند ہے۔"

"اچھا!" وہ بڑی حیران ہوئیں۔ "حیرت ہے۔"

"اصل میں جی وہ تو ہیں اتنے اچھے، پڑھے لکھے اور میں گاؤں کی دیہاتن، صفا ان پڑھ، جاہل۔ میرا ان کا تو کوئی جوڑ بنتا ہی نہیں ہے نا۔ اس لیے میں خود ہی ڈرتی رہتی ہوں کہ ان کو میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔"

وہ آج بے حد ملول تھی، اجڑی ہوئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ہو جس سے وہ اپنے دل کی ڈھیر ساری باتیں کر لے۔

"تو کیا ہوا بھئی۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ایک مہینے کا عرصہ تو قطعی ناکافی ہے۔ میں نے کئی ایسے جوڑے بھی دیکھے ہیں جو دیکھنے میں بہت بے جوڑ لگتے ہیں، مگر آپس میں بہت خوش ہیں۔"

"میں تو سمجھ گئی ہوں ان کا مزاج۔ وہی نہیں سمجھتے مجھے۔" وہ پھیکی ہنسی ہنسی۔

"تو کیا تم بالکل بھی پڑھی ہوئی نہیں ہو؟"

"نہیں جی۔ آٹھ جماعتیں پڑھی ہیں، میں نے گاؤں کے مدرسے سے۔" اس کے لہجے میں فخر آگیا۔

"بس یہ شہر کی لڑکیوں کی طرح گٹ مٹ کرنا نہیں آتی مجھے۔" اس کے تصور میں رشنا آگئی۔ ساجدہ بے ساختہ ہنس دیں۔

"تو تم بھی سیکھ لو نا۔"

"کیسے سیکھوں جی۔ مجھے تو انگلش کی الف بے بھی نہیں آتی۔"

"آنٹی۔ انگلش کی الف بے نہیں ہوتی۔ اے بی سی ڈی ہوتی ہے۔" حسن جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، بول اٹھا۔

ساجدہ اور نصیبے دونوں ہنس دیں۔

"دیکھا جی، مجھے تو اتنا بھی نہیں پتا۔ میں بھلا کیسے سیکھوں گی؟"

”آنٹی! اے۔ بی۔ سی۔ ڈی تو میں سکھا دوں گا آپ کو پتا ہے میں فورتھ کلاس میں ہوں۔“

”اچھا!“ نفیسہ کے لہجے میں اشتیاق در آیا۔ ”تم مجھے سکھا دو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ ساجدہ بولیں۔ ”یہ روز آکر تمہیں کچھ نہ کچھ پڑھا دے گا۔ کیوں حسن بیٹے؟“

”جی ممی۔“ وہ پُرجوش ہوا۔ ”بلی سے تو میں اتنا کہتا ہوں آؤ اسکول اسکول کھیلیں، پر وہ بھاگ جاتی ہے، اب میں آنٹی کا ٹیچر بن جاؤں گا۔“

”پھر روز آیا کرنا۔“ نفیسہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ بھی کبھی انگلش بول سکے گی۔

”جی آنٹی روز آؤں گا۔“

ساجدہ تھوڑی دیر تک بیٹھی اس سے اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔ ان کا تسلی دینے کا انداز بہت اچھا تھا۔ نفیسہ کے دل کا بوجھ بڑی حد تک کم ہو گیا۔ پھر اس سے گھر آنے کا وعدہ لے کر وہ گئیں تو اس نے دوبارہ کچن میں آکر کام کا آغاز کیا۔

وہ بڑی پریشان سی پورے گھر میں پھر رہی تھی۔ شام ڈھل چکی تھی۔ اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ویسے روز وہ دوپہر کے کھانے تک آجاتا تھا۔ مگر آج اتنی دیر ہو جانے کے باوجود اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ نفیسہ انتظار کر کر کے تھک چکی تھی۔ بالآخر چھ بجے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اور باہر گاڑی کا ہارن بجا۔ اس نے بھاگ کر گیٹ کھولا۔

”اتنی دیر لگا دی آپ نے۔“ اس نے کہا۔ وہ چپ چاپ گاڑی لاک کرتا رہا۔

”میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی۔“ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی بولی۔

”کیوں؟“ وہ یک دم پلٹا۔

”کیا ضرورت تھی پریشان ہونے کی؟ مر گیا تھا کیا میں؟ یا بندھا ہوا ہوں میں تم سے۔ جب میری مرضی ہو گی تب آؤں گا، اور مرضی ہو گی تو نہیں بھی آؤں گا۔ تم کو ضرورت نہیں ہے پریشان ہونے کی، تمہاری اپنی ذات ہی کافی ہے دوسرے کے لیے پریشانیاں اور دشواریاں پیدا کرنے کے لیے۔“

وہ دھم دھم کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دم بخود سی کھڑی رہ گئی۔ بھلا اس نے کیا کیا تھا۔ اور کیا کہا تھا جس پر وہ یہ سب کچھ سنا کر چلا گیا تھا۔ اور اس کی ذات سے اس کو کون سی پریشانیاں لاحق ہوئی تھیں؟ اس نے تو کبھی بھول کر بھی اس سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کوئی سوال نہ کیا تھا۔

بہت دل گرفتہ، بہت ہی ملول وہ اجڑی اجڑی سی سارے گھر میں پھرتی رہی۔ کس جگہ اس کا کیا قصور تھا جس کی اس کو یہ سزا، یہ قید تنہائی مل رہی تھی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی خدا سے اپنے شہزادے کو پانے کا تقاضا نہ کیا تھا۔ اس کی خواہشیں، اس کی دعائیں ہمیشہ ہی بہت محدود رہی تھیں۔ پھر اس کو کس بات کی سزا مل رہی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکی۔

رات خاموشی سے چلی آئی۔ اور اندھیرے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا تو اس نے اٹھ کر بتیاں جلائیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس کے کمرے تک آگئی۔ دستک دے کر اس نے اندر جھانکا۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ کہنی میز پر ٹکا کر ہتھیلی پر گال رکھے، دوسرے ہاتھ سے قلم تھامے بڑی آہستگی سے کاغذ پر چلا رہا تھا۔

”سنیے۔“ اس نے ہمت کر کے پکارا تو اس نے دروازے کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”کھانا لے آؤں؟“

”نہیں۔“

”کھا لیں ناں۔ اتنا سارا پکا کر رکھا ہے میں نے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”جب کہہ دیا کہ نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ نہیں۔ بس اب جاؤ۔“

اس نے سختی سے کہا تو وہ باہر نکل آئی۔ لان کے آگے بنی ہوئی سیڑھیوں پر بیٹھی چہرا گھٹنوں پر ٹکائے وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ سارا دن وہ تنہا رہتی۔ وہ آجاتا پھر بھی وہ تنہا ہی رہتی۔ بھلا وہ کب اس کی تنہائی شیئر کرتا تھا۔ وہ کب اس سے بات کرتا تھا۔ اور سب سے بڑی سزا ہی قید تنہائی ہوتی ہے۔ خاموش رہ رہ کر اس کا منہ دُکھنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ دیواروں سے باتیں کرنا شروع کر دے۔ کوئی تو ہمدرد، کوئی تو غم گسار ہو۔

کافی دیر گزر گئی تو وہ اٹھ کر اندر آئی۔ ایک گلاس دودھ نکالا۔ اور اس کے کمرے تک آئی دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ اس نے اندر جھانکا۔ کمرا خالی تھا۔ غالباً وہ کپڑے بدلنے کے لیے ابھی اٹھ کر باتھ روم میں گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر چلی آئی۔ ڈھکا ہوا گلاس میز پر رکھ کر وہ مڑی ہی تھی کہ اس کی نگاہ میز پر رکھے صفحات پر چلی گئی۔ آڑی ترچھی لائنوں میں اس نے جانے کیا کیا لکھ رکھا تھا۔

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دل بے خبر مری بات سن اسے بھول جا اسے بھول جا

اب خوشی ہے، نہ کوئی رنج ہے رُلانے والا
ہم نے اپنا لیا ہر رنگ زمانے والا!!

”رہتا نہیں انسان تو ہوتا نہیں غم بھی!!
اک روز زمیں اوڑھ کے سو جائیں گے ہم بھی

ہاں حلف وفا شوق سے اٹھوائیے لیکن
ہم لوگ وفادار ہیں بے قول و قسم بھی!

کہاں آکے ملتے تھے راستے کہاں موڑ تھا اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا

اور اسی طرح کے کئی غمگین اشعار اور اداس گانوں کے بولوں سے اس نے کئی صفحوں کو سیاہ کر رکھا تھا۔ اتنے دم میں گرتے پانی کی آواز بند ہوئی تو وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔

رہتا نہیں انسان تو ہوتا نہیں غم بھی
اک روز زمیں اوڑھ کے سو جائیں گے ہم بھی

اس نے زیر لب دہرایا اور پھر جانے کیا ہوا۔ وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ گزشتہ دنوں کے جتنے آنسو اس نے اپنے اندر جمع کیے تھے، وہ سارے کے سارے ایک مرتبہ ہی بہا دیے۔

”وہ خوش نہیں ہیں میرے ساتھ۔“ اس نے روتے روتے سوچا۔

”شاید وہ کسی اور کو چاہتے ہوں گے۔ خالہ نے زبردستی پکڑ کر مجھ سے بیاہ دیا، میری وجہ سے وہ پریشان رہتے ہیں۔ بھلا مجھ جیسی جاہل، اجڈ، ان پڑھ لڑکی کا ان سے کیا جوڑ تھا؟ وہ اتنے خوبصورت، اتنے شاندار، پڑھے لکھے اور میں! کالی بھجنگ اور بالکل بے عقل۔“ وہ روتی رہی۔

”خالہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اپنے بیٹے کے ساتھ میں ہیں ان کو افسردہ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں تو بے شک کریں۔ میں تو ہوں ہی ایسی۔ لیکن میں تو ان کو چاہتی ہوں ناں۔ بھلا میں کیسے انہیں پریشان دیکھوں۔ میں چلی جاؤں گی گاؤں۔ واپس چلی جاؤں گی۔ اتنے دن ان کے ساتھ رہی تو اسی لیے کہ ان سے محبت ہے۔ ان کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اور اب جاؤں گی بھی تو اسی لیے کہ ان سے محبت ہے۔ اس لیے انہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ حیدر! میں چلی جاؤں گی، جہاں سے آئی تھی وہیں۔ ہمیشہ کے لیے۔“

صبح فجر کی نماز پڑھ کر وہ باہر آگئی۔ پچھلے تین دن سے اس کا معمول تھا کہ وہ صبح کی نماز پڑھ کر حسن کا دیا ہوا سبق پڑھا کرتی تھی۔ مگر آج اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ”جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس کیا گننے؟“ اس نے سوچا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب کو دیکھا۔

”اے۔ بی۔ سی۔ ڈی“ اس کے صفحے پلٹ پلٹ کر وہ پڑھتی رہی۔ تین دنوں میں اس نے رنگین تصویروں سے مزین پوری بک پڑھ کر یاد کر لی تھی۔ اس نے تو حسن سے شرط بھی لگائی تھی کہ ”تم دیکھنا یہ انگریزی قاعدہ، تین دن میں سیکھ جاؤں گی ہاں۔“ اور شرط کے عین مطابق اس نے پورا انگریزی قاعدہ، تین دن میں یاد بھی کر لیا تھا۔ وہ تو ہر وہ چیز سیکھنا چاہتی تھی جو حیدر کو پسند ہو، لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ جب حیدر کو وہ خود ہی پسند نہیں ہے تو باقی چیزیں تو ثانوی ہیں۔ آنکھوں میں بھر آنے والے آنسو پونچھ کر وہ مڑی تو اچانک ڈر گئی۔ جانے کب سے وہ اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ اور ویسے بھی وہ تو کبھی اتنی علی الصبح نہ اٹھتا تھا۔ گھبراہٹ میں ہاتھ میں پکڑی کتاب اس نے پیچھے چھپائی۔

”کیا چھپا رہی ہو؟“ اسے گھور کر سوال کیا۔

”کک۔ کچھ نہیں جی!“

”ادھر دکھاؤ۔ کیا ہے؟“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”نہیں جی آپ کے کام کی کوئی چیز نہیں ہے۔“ اسے بے حد خفت محسوس ہو رہی تھی۔

”دکھاؤ۔“ ڈپٹ کر کہا تو ناچار اس نے پیچھے چھپائی ہوئی نرسری کلاس کی بک اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”اوہ۔“ اس نے ہونٹ سکیڑے۔

”تو تعلیم بالغاں کا سلسلہ جاری ہے۔ کیوں پڑھتی ہو یہ؟“

"بس۔ ایسے ہی!" وہ شرمندہ ہوئی۔
"ایسے ہی کیوں؟" وہ بضد تھا۔
"وہ۔ آپ کو پسند ہے نا انگریزی بولنا۔ تو اس لیے" اس نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ بتایا۔
"اوہو۔ تو یہ بات ہے!" وہ زیر لب مسکرایا۔
"پھر آگئی فر فر انگلش بولنا۔ اسے فار ایپل۔ بی فار بٹر فلائی!"
"نہیں جی۔ بی فار بیٹ ہوتا ہے!" اس نے تصحیح کی "اس میں یہی لکھا ہے!" وہ بے ساختہ ہنس دیا۔
"اوہ ہاں۔ سوری غلطی ہو گئی۔ دراصل میرا دماغ کچھ کمزور ہے۔ خیر آئندہ جو بھی غلطی ہو مہربانی فرما کر درست کر دیا کریں!"
کتاب اس کو تھما کر وہ مڑ کر واپس اندر چلا گیا۔ وہ وہیں کھڑی سوچتی رہی کہ وہ مذاق کر کے گیا ہے یا طنز۔

ناشتا کر کے وہ چلا گیا تو اس نے اپنی تمام چیزیں جمع کیں۔ اپنا ٹرنک تیار کیا۔ پھر کھانا بنا کر رکھا اور کپڑے بدل کر گھر سے باہر آگئی۔ سامنے ہی ساجدہ کا گھر تھا۔ اس نے بیل بجائی اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ دروازہ ساجدہ نے ہی کھولا تھا۔
"ارے نصیب تم؟" وہ خوش ہو گئیں۔ "آؤ نا!" وہ اسے بڑے پیار سے اندر لے گئیں۔
"کیا ہوا کچھ پریشان لگتی ہو؟" انہوں نے اسے بٹھا کر بغور اس کا چہرا دیکھا۔
"ہاں باجی!" اس نے ہتھیلیاں مسلیں۔
"کیا ہوا؟ میرا بیٹا اچھا نہیں پڑھا رہا ہے کیا؟ ٹیچر کی شکایت لائی ہو؟" وہ ہنسنے لگیں۔
"ساجدہ باجی! آپ مجھے میرے گاؤں تک پہنچا دیں جی!" اس نے ہنسے بغیر اپنا مدعا بیان کیا۔
"کیوں؟" وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوئیں "کیا ہوا؟ لڑائی ہو گئی؟"
"نہیں جی لڑنا کس سے ہے؟ نصیب سے کون لڑ سکتا ہے" وہ افسردہ ہوئی "بس اب میں اپنے گھر جاؤں گی!"
"تمہارا گھر تو یہی ہے۔ اور کون سا گھر ہے تمہارا؟"
"نہیں جی خالی مکانوں کو گھر تھوڑا ہی کہتے ہیں۔ میں تو بس اپنے گاؤں جاؤں گی اب!" اسے رونا آگیا۔
"نصیب بری بات ہے۔ ایسے نہیں کہتے!" انہوں نے پیار سے اسے لپٹا لیا۔ "مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟" آنسوؤں اور ہچکیوں کے ساتھ اس نے ساری باتیں انہیں کہہ سنائیں۔
"مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے باجی! بھلا ان کا کیا قصور۔ دل پر انسان کا زور تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ انہیں جب میں پسند ہی نہیں ہوں تو وہ کیا کر سکتے ہیں!"
"تم تو کر سکتی ہو نا!"
"میں؟ میں کیا کر سکتی ہوں باجی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔
"تم بالکل ویسی بن سکتی ہو جیسا وہ چاہیے!" انہوں نے سمجھایا۔ "دیکھو نصیب ابھی یہ جلد بازی میں کیا ہوا فیصلہ تمہیں اس سے دور تو کر دے گا ہمیشہ کے لیے لیکن بعد میں انہیں افسوس ضرور ہوگا۔ بعد میں تمہیں خود پر حیرت ہوگی کہ بس اتنی سی بات پر تم نے اپنا گھر اجاڑ دیا۔ اور پھر اس طرح تمہارے چلے جانے سے تو اس کے مسائل بڑھ جائیں گے۔ سارے دوست اس سے پوچھیں گے۔ باتیں بنائیں گے۔ اور پھر تمہاری خالہ۔ وہ تو مر جائیں گی اس صدمے سے!"
"پھر میں کیا کروں؟" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔
"ہمت کرو۔ صبر کرو اور کوشش کرو، اس کی پسند کے مطابق ڈھلنے کی۔ تم گاؤں کی لڑکی ہو یہ میں مانتی ہوں۔ لیکن کتنے سال تک تم اپنے خول میں بند رہو گی۔ آخر کو یہاں زندگی گزارو گی، لوگوں سے ملو جلو گی تو تمام باتیں خود ہی سیکھ جاؤ گی۔ زیادہ سے زیادہ دو تین سال اور بس۔ پھر کسی کو تم سے مل کر پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کب کہاں سے آئی تھیں۔ اور پھر گاؤں سے تعلق رکھنا تو کوئی باعث شرم بات نہیں ہے۔ تمہارا اخلاق، تمہارا حسن سلوک ہی کافی ہوگا لوگوں کو گرویدہ کرنے کے لیے بس تم ہمت مت ہارنا۔ انسان سیکھنے پر آئے تو وہ کیا نہیں سیکھ لیتا۔"
انہوں نے اپنی بات ختم کی تو خلاؤں میں گھورتی نصیب چونکی۔
"باجی! میں بن سکتی ہوں ایسی؟"
"تم خود ہی سوچو۔ بھلا کیا فرق ہے تم میں اور شہر کی کسی لڑکی میں۔ تعلیم اور رہن سہن کا۔ بس نا۔ اور اتنی سی باتیں بھلا کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ تم بس کبھی احساس کمتری کا شکار مت ہونا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں جلد ہی تم اپنے شوہر کا دل جیت لو گی!"
"سچ ساجدہ باجی!" وہ کھل اٹھی "میں ضرور کوشش کروں گی!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ارے بیٹھو تو۔ ابھی تو میں نے تم کو چائے بھی نہیں پلائی۔"
"چائے اب میں پلاؤں گی آپ کو۔ آپ نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔ کتنی اچھی ہیں آپ!"
"تم خود بہت اچھی ہو نا۔ اس لیے تمہیں سب ہی اچھے لگتے ہیں!" وہ ہنسیں۔
"اچھا باجی اب میں جاتی ہوں۔ حسن سے کہنا کہ میں نے پوری کتاب یاد کر لی ہے۔ اب مجھے دوسری کتاب لا دے!"
"اچھا اچھا!" وہ ہنسیں "اسکول سے آئے گا تو بھیج دوں گی تمہارے ٹیچر کو!"

گھر آ کر اس کے دل کا بوجھ اور ذہنی پریشانی میں خاطر خواہ کمی ہو گئی تھی۔ ساجدہ کی باتوں نے اس کے اندر ایک نیا ولولہ اور نیا عزم پیدا کر دیا تھا۔
"خواہ کچھ ہو جائے میں انہیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی!" اس نے سوچا۔
"ہاں بھلا کیا کہیں گے ان کے دوست کہ بیوی چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اور پھر خالہ کیا سوچیں گی۔ کتنی پاگل ہوں میں ان کے لیے اور پریشانیاں کھڑی کرنے جا رہی تھی۔ اب میں بالکل ویسی ہی بن جاؤں گی جیسی وہ چاہتے ہیں پر انہیں کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟" اس نے سوچا اور دیر تک سوچتی رہی۔
اور اچانک اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ "ہاں وہ رشنا اس کے ساتھ کیسا ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ کتنے غور غور سے دیکھ رہے تھے اس کو۔ کتنی تعریفیں کر رہے تھے اس کی۔ پر مجھے تو ساڑی پہننا نہیں آتی۔ میرے تو بال بھی لمبے ہیں۔ ہونہہ کیا کرنا ہے اس گھاس پھونس کا۔ بس ذرا مجھے انگریزی آ جائے۔" اس نے سوچا اور مطمئن ہو کر کام میں لگ گئی۔

سوتے سوتے اس نے کروٹ لی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔ شام ڈھل رہی تھی۔ کتنی ہی دیر ہوگئی تھی اسے سوتے ہوئے۔ ایک جمائی لے کر وہ اٹھ گئی۔

"آج تو ان کو چائے بھی نہیں دی۔" اس نے سوچا۔ اور اٹھ کر باہر آگئی۔ کچن کی طرف جاتے جاتے اچانک ہی وہ رک گئی۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"جانے کون آیا ہے۔" وہ سوچتی ہوئی ڈرائنگ روم تک آئی۔ اور شاید حیدر کا دوست لیاقت تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔

"چلو جلدی سے چائے بنالوں۔" وہ سوچ کر پلٹی اور پھر ٹھٹھک گئی۔ اندر سے آتی آوازوں میں اس کا نام بھی شامل تھا۔

"لیاقت میں سوچ سوچ کر پاگل ہوجاؤں گا۔ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا یار۔ نصیبے میرا آئیڈیل نہیں تھی۔ تو تو مجھے جانتا ہے یار۔"

"حیدر یار۔ عقل سے کام لو۔ یا تو تم نے ایسا کرنا ہی نہیں تھا۔ اور اب کیا ہے تو نبھاؤ بھی۔ بھلا بھابی بیچاری کا اس میں کیا قصور۔"

"یہ سب مجھے بھی پتا ہے۔ وہ بے قصور ہے مجھے بھی نظر آتی ہے۔ مگر دل کا کیا کروں؟ میرا ایک تصور تھا یار ایک سوچ تھی۔ اور پھر لوگوں کی باتیں۔" دبی دبی سسکیاں تھیں۔

"گولی مارو لوگوں کو۔ کتنے دن لگیں گے بھابی کو تبدیل کرنے میں۔ تم ان کو اعتماد دو۔ ان کی مدد کرو۔ دیکھنا وہ کتنی اچھی بیوی ثابت ہوں گی۔ مجھے لوگوں کی پہچان تم سے زیادہ ہے۔ اچھا چلو اب منہ مت بناؤ اور مجھے چائے پلواؤ اچھی سی۔"

وہ جلدی سے مڑ کر کچن میں آگئی۔ چند لمحوں بعد وہ بھی چلا آیا۔

"سنو۔ چائے بنالو اچھی سی۔ لیاقت آیا ہے۔"

"اچھا۔ ابھی لاتی ہوں۔" اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ کتنا قیامت ہوتا ہے۔ کبھی کبھی خود کو پُرسکون رکھنا۔ اپنی سوچیں خواہ کیسی بھی ہوں، اتنی تکلیف نہیں دیتیں۔ لیکن وہی بات کسی کی زبان سے سن کر دل پر کتنے تیر چلتے ہیں۔ کاش کہ کہنے والوں کو اس کا اندازہ ہوا کرے۔

چائے بنا کر وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے رکھ کر دروازہ بجا کر واپس کچن میں آگئی۔

کھانا پکاتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر چولہے کی آنچ تیز تر کر دی۔ گرمی میں خود کو جلانے سے اندر کا الاؤ کچھ کم لگ رہا تھا۔ تا دیر وہ سخت گرمی میں کھڑی بے وجہ ہی کام کرتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ خود سے کیا گیا عزم بھی دل میں دہرا رہی تھی۔ ہمت ہارنے کا ارادہ اس نے ملتوی کر دیا تھا۔

دوسرے دن۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ نہائی اور بال سکھا کر ساجدہ کے پاس چلی آئی۔

"باجی! مجھے ذرا بازار لے چلیں گی۔"

"کیوں کیا لینا ہے؟"

"دو تین چیزیں خریدنی ہیں اور۔"

"ہاں اور کیا؟"

"اور وہ بال کٹوانے ہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا؟" وہ چیخیں۔ "یہ بال کٹواؤ گی۔ دماغ خراب ہے تمہارا؟"

"کیوں باجی کیا ہوا؟ آپ کے بال بھی تو چھوٹے ہی ہیں۔"

"ارے تو میرے بال تو دیکھو۔ چار لٹیں گنتی کے۔ تمہارے بال ماشاء اللہ اس قدر خوبصورت ہیں کہ نظر نہیں ہٹتی تمہاری چوٹی سے۔ اس قدر خوبصورت بال تو نصیب سے ہی ملتے ہیں۔"

"اصل میں باجی جسے اچھے لگنے چاہئیں۔ جب اسی کو پسند نہیں تو کیا فائدہ اس تعریف کا بھی۔ بس میں کٹوانا چاہتی ہوں۔"

"دیکھو نصیب!" وہ بے بس سی ہوگئیں۔ "خیر تمہاری مرضی۔ حیرت ہوتی ہے تمہارے شوہر پر۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

بیوٹی پارلر میں اس نے البم میں سے وہی اسٹائل پسند کیا جو رشنا کے بالوں کا تھا۔

"بس ایسے بنا دیں میرے بال!" وہ تصویر دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔

"دیکھیں بی بی۔ سوچ لیں کافی چھوٹے ہوجائیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ اور کٹ

کٹ قینچی چلنے کی آوازیں سنتی رہی۔

"ہائے نصیب!" ساجدہ باجی نے فرش پر بکھرے لمبے، سیاہ بال دیکھ کر دل تھام لیا۔ مگر وہ بے پروائی سے اپنے شانوں تک کے بال ہلا ہلا کر آئینے میں دیکھتی رہی۔

وہاں سے واپسی پر اس نے بازار سے ایک ساڑی خریدی۔ ڈیپ ریڈ کلر کی ساڑی پہ گولڈن پھول بنے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی میچنگ کی گولڈن نازک سی سینڈل لی تھی۔

گھر آکر وہ بے حد خوش تھی۔ بستر پر بکھری چیزیں دیکھ ہی رہی تھی کہ باہر گاڑی کا ہارن بجا۔ جھٹ پٹ اس نے ساری چیزیں چھپائیں۔ بڑی سی چادر سے سر ڈھانپا اور باہر آکر گیٹ کھولا۔ گاڑی سے اترتے حیدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ماتھے تک اوڑھی ہوئی چادر جو پیچھے پیروں تک جا رہی تھی۔

"کہیں جانا ہے؟" اس نے اتر کر پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"یہ بیڈ شیٹ کیوں اوڑھ رکھی ہے؟"

"وہ دوپٹہ نہیں مل رہا تھا ناں۔" وہ بوکھلا گئی۔ جلدی میں وہ بستر پر سے ہی چادر کھینچ لائی تھی۔

"دوپٹہ نہیں ملا تو بیڈ شیٹ اوڑھ لی؟" حیدر کو اس کی دماغی حالت پر شبہ گزرا۔ اسے عجیب سی نظروں سے گھورتا ہوا وہ کمرے میں چلا گیا۔

اس نے اسی حالت میں بڑی مشکلوں سے کھانا گرم کیا۔ اور جلدی سے کمرے میں رکھ کر باہر نکل آئی۔ کافی دیر بعد جب اسے یقین ہوگیا کہ اب وہ کھانا کھا کر سو چکا ہوگا۔ تب چپکے سے وہ اپنے اسٹور نما کمرے میں آگئی۔ چادر اتار کر بستر پر پھینکی، اور ساڑی والا ڈبا نکالا۔ بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہننا تو آسان تھا۔ مگر ساڑھی باندھنے میں اس کے چھکے چھوٹ گئے۔

"کیا مصیبت ہے۔ اتنی لمبی کو کتنا لپیٹتے ہیں آخر؟" اسے غصہ آنے لگا۔ کافی دیر تک وہ ساڑھی سے الجھتی رہی۔ آخر جتنی لپیٹ سکتی تھی لپیٹ لی۔ پھر گردن میں دو تین بل دے کر اٹکائی اور بیٹھ کر سینڈل پہننے لگی۔

"ہاں بھلا کیا فرق ہے اس رشنا میں اور مجھ میں؟" بڑا کارنامہ سرانجام دے کر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر طنز سے سوچا۔

بس اس کی ساڑھی ذرا سی اچھی نہیں بندھی تھی نا۔ میں بھی سیکھ لوں گی ساجدہ باجی سے۔ لیکن چلوں کیسے؟ لمبی ہیل اور سختی سے لپٹی ہوئی ساڑھی سے اس کا قدم بڑھانا محال ہوگیا۔

"یا اللہ میں تو پھنس گئی ہوں اس میں!" اس نے بیچارگی سے سوچا۔ اچانک ہی دروازہ کھلا اور حیدر اندر داخل ہوا۔

"بات سنو!" اس کے الفاظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ بے حد حیرانگی سے اس نے سامنے کھڑی نصیبے کو دیکھا۔ نصیبے نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور بھاگ کر باتھ روم کی طرف جانا چاہا۔ مگر لمبی ہیل اور قدموں میں لپٹی ساڑھی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اور وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح دھڑ سے فرش پر گری۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟" اسے سہارا دے کر اٹھاتے حیدر نے حیرت سے کہا۔

"تمہارے بال۔ اوہ گاڈ۔ یہ کیا کیا تم نے؟"

"آپ ہی کو تو پسند ہے نا ایسا بننا!" بہت شدت

سے چوٹ لگی تھی۔ اسی لیے آنسو آ گئے۔

"مجھے۔ مجھے پسند ہے؟ کس نے کہا؟" وہ ابھی تک جیسے صدمے کی سی حالت میں تھا۔

"وہ آپ کی دوست رشنا بھی تو ایسی ہی ہے نا۔" اس نے گردن سہلائی۔

"رشنا؟ لاحول ولا قوۃ۔" وہ جھنجھلایا۔ "تمہیں کس نے کہا وہ پرکٹی ہیروئن مجھے پسند ہے؟"

"خود ہی ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اس سے۔" اسے رونا آنے لگا۔

"وہ تو۔ وہ تو اسے جلانے کے لیے۔ بڑا ناز ہے اسے خود پر۔ نفرت ہے مجھے اس بے کردار عورت سے۔ اور تم۔ تم اس جیسی بننا چاہتی ہو۔ تم نے اس قدر حسین بال کٹوا دیے۔ پوچھے بغیر؟" ناقابلِ برداشت غصے کی وجہ سے اس نے ہلکا سا تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ رونے لگی۔

"میں پسند نہیں ہوں ناں آپ کو۔ مجھ سے نفرت کرتے ہیں آپ۔ مجھے چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

آپ کہیں۔ میں بالکل ویسی بن جاؤں گی جیسا آپ چاہیں۔ میں ہر کام کر سکتی ہوں آپ کی خوشی کے لیے۔"

"اچھا!" وہ بغور اسے دیکھنے لگا۔

"مثلاً کیا کیا کر سکتی ہو؟"

"جو آپ کہیں۔ مجھے ہر کام آتا ہے۔" وہ بڑے مان سے بولی۔

"اچھا؟" وہ ہنس دیا۔ "رس گلے بنانے آتے ہیں؟"

"ہیں؟ نہیں جی۔ وہ تو نہیں آتے!" (یہ بھی کوئی کام ہوا!)

"اچھا۔" وہ سوچنے لگا۔ "ہاں۔ ٹائی کی ناٹ بنانی آتی ہے؟"

"نہیں جی۔ وہ تو مشکل ہے۔"

"ہاں مشکل تو ہے۔ خیر چلو کوئی بات نہیں۔" اس نے بے ساختہ ہنسی چھپائی۔

"کوٹ تو سینا آتا ہوگا؟"

"کوٹ؟ نہیں جی۔ ایسے کپڑے تو سینے نہیں آتے۔"

اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ "مجھے تو واقعی کچھ نہیں آتا!"

"نہیں اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ رونا تو آتا ہے۔ چھپ چھپ کر باتیں سننا بھی آتی ہیں، دودھ رکھنے کے بہانے جاسوسی کرنا بھی آتی ہے۔ اتنے کام تو آتے ہیں۔ اور اب تو انگریزی بولنا بھی آ گئی ہے!" وہ شرم سے لال چہرا لیے سینڈلیں اتارنے لگی پھر اس نے سر اٹھایا۔

"آپ۔ آپ چھوڑ دیں گے مجھے؟"

وہ کچھ دیر اس کی آس و ہراس میں ڈوبی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھا۔

"اصل میں بات یہ ہے مسز نصیب حیدر کہ مشہور ہے کہ دل آنا ہو تو کسی گدھی پر بھی آ جاتا ہے۔ اور ابھی ابھی مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ میرا دل تم پر آ گیا ہے۔ تم ایسی گدھی ہو جو میرے لیے دنیا کا ہر کام کر لینے کا عزم رکھتی ہے۔ اس لیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ۔ آپ۔ مجھے نہیں چھوڑیں گے نا۔" وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔

"اب۔ اب لگتی ہوں نا میں آپ کو؟"

"کیا لگتی ہو؟" وہ حیران ہوا۔

"وہی گوڈی۔" وہ شرما کر بولی۔

"گوڈی۔" وہ حیران ہوا پھر ہنس دیا۔

"گوڈی نہیں بلکہ ویری گوڈی!"

اور اس کی ہنسی میں شامل ہوتی ہوئی نصیب کو لگا جیسے اس کے نصیب کا ہر دروازہ کھل گیا ہو۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چاروں طرف سے آ رہی ہوں۔

